

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

حسین پھول اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ
_____ انسانوں کے درمیان پھول بن کر رہو

قیمت فی پرچہ	۲۴ روپے	زر تعاون سالانہ	شمارہ ۲۹
	ایک سو روپے	خصوصی تعاون سالانہ	
دو روپے	۱۵ ڈالر امریکی	بیرونی ممالک سے	اپریل ۱۹۷۹

اسلام دین فطرت

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی 6

قیمت دو روپے

سال اشاعت ۱۹۷۹

فہرست

- ۳ آغاز
- ۴ آدمی کا امتحان
- فرشتوں کا سجدہ ، ابلیس کا انکار
خدا کے حکم سے حق دار کے آگے جھک جانا
- ۷ توحید کا تصور اسلام میں
- توحید کی عملی اہمیت ، توحید کا عقیدہ اور انسان
قرآن اور کائنات ، خدائی اخلاقیات کا ظہور کائنات میں
آخرت کی معیاری دنیا میں کون لوگ جگہ پائیں گے۔
- ۱۸ اسلام دینِ فطرت
- اسلام کے پانچ ارکان
اللہ اور رسول پر ایمان
نماز ، روزہ ، زکوٰۃ ، حج
- ۲۸ آخرت کی دنیا
- زندگی کی مثال آئس برگ کی ہے
انسان ایک ذمہ دار مخلوق
عمل کے دو رخ
آدمی کی منزل : آخرت
- ۲۳ ہدایت کا انتظام
- فرشتے ہر وقت خاموش زبان میں بتا رہے ہیں
- ۳۶ انسان کی تلاش
- با خدا زندگی اور بے خدا زندگی
ہمارے نوابوں کی دنیا صرف آخرت میں بن سکتی ہے
خدا انسانی فطرت کی آواز
- ۴۰ مختلف قوموں کی مثالیں
- نازک لمحات میں آدمی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔
- نماز سے آغاز
- ۴۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کوئی آدمی دولت کے لئے جیتا ہے، کوئی عزت کے لئے، کوئی اقدار کے لئے۔ ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نہ کسی چیز میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہو۔ جس کو وہ سب سے زیادہ قابل لحاظ سمجھے۔ جس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھے۔ جس کے لئے ڈر ڈر دھوپ کرے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے، اس کی تمنائیں اور اس کی حسرتیں سب سے زیادہ اس سے وابستہ ہوں۔ اس کو پا کر وہ سب سے زیادہ توش ہو اور اس کے چھپنے کا ڈر ہو تو وہ سب سے زیادہ غم گین ہو جائے۔

یہی دین ہے۔ اس معنی میں ہر شخص کا ایک دین ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے ایک دین سے خالی نہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنا ”دین“ بنائے اسی کے مطابق اس کی پوری زندگی بنتی ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات، اس کا لین دین، اس کے انسانی تعلقات، اس کی سرگرمیاں اور کارروائیاں سب اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ اس کام کو کرتا ہے جس سے اس کا مقصد ملنے والا ہو، اس کام سے دور بھاگتا ہے جس سے اپنے مقصد کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہی دین اس کا حاکم ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے ہر حال میں وہ اسی دین کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ دین خدا کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر خدا کا بھی۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ آدمی کون سا دین اختیار کرتا ہے۔ خدا کا یا غیر خدا کا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ یہاں غیر خدا کے دین کو پکڑ کر بھی آدمی عزت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ کامیابی بالکل وقتی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ موت تک آدمی کا ساتھ دے گی اس کے بعد اگلی مستقل دنیا میں وہ اس حال میں اٹھے گا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اگلی دنیا میں خدا اپنے قدرت اور جلال کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے وہاں عزت و کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہوگی جس نے موجودہ دنیا میں خدا کے دین کو اپنا دین بنایا ہوگا۔ جو کسی دوسرے دین کو اختیار کرے گا، اس کے لئے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ناکامی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا دین ہی انسان کے لئے فطری اور حقیقی دین ہے۔ یہ حقیقت ڈر کے لمحات میں کھل جاتی ہے۔ آدمی خواہ کوئی بھی دین اختیار کرے۔ خواہ وہ کوئی بھی سہارا پکڑے۔ مگر جب انسان کی زندگی کا جہاز کسی بھنور میں پھنستا ہے جب اس پر کوئی نازک لمحہ آجاتا ہے، اس وقت اس کو تمام چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس وقت وہ بے اختیار ہو کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کبھی نہ کبھی ہر شخص کی زندگی میں گزرتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی دین صرف خدا کا دین ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اسی کو اپنی زندگی کا دین بنائے۔ اس کے سوا وہ جس دین کو بھی پکڑے گا وہ وقت آنے پر اسی طرح بے حقیقت ثابت ہوگا جیسے آج نازک لمحات میں تمام چیزیں بے حقیقت ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج کے حالات میں فطرت کی پکار آئندہ آنے والی مستقل دنیا کا ایک اشارہ ہے۔ وہی شخص کامیاب ہے جو اس اشارہ پر کان لگائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنائے۔

آدمی کا امتحان

پہلا انسان جو خدا نے پیدا کیا وہ آدم تھے۔ اس وقت خدا کی پیدا کی ہوئی دو مخلوقات اور تھیں۔ ایک فرشتے دوسرے جن۔ خدا نے فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ تم سب آدم کے آگے سجدہ کرو۔ فرشتے خدا کا حکم سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس، جو جنوں کا سردار تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔ ابلیس بولا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے (اعراف ۱۲) ابلیس خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ آدم کو سجدہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملعون اور جہنمی قرار دے دیا گیا۔

یہی معرکہ آدم کی اولاد میں آج بھی جاری ہے۔ ایک طرف فرشتے ہیں جو آدمی کو تسلیم اور اعتراف کا سبق دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ابلیس ہے جو انسان کی رگوں میں تیرتا ہے اور آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ خود پسندی (انا خیر منہ) کا طریقہ اختیار کرے اور اس کا ہم مسلک بن جائے۔ اس طرح ہماری زندگی میں دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی کہانی دہرائی جا رہی ہے جو پہلے انسان کی پیدائش کے وقت ابتداءً پیش آئی تھی۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم کبھی نہ کبھی ایک ”آدم“ سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارا سابقہ کسی نہ کسی انسان سے پڑتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حق ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ ایک اچھے بول کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ ایسے ہر موقع پر خدا اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل میں اس آدم کے سامنے جھک جاؤ۔ اب جو لوگ فرشتوں کی روش کو اختیار کریں اور اپنے بارے میں خدا کے حکم کو پہچان کر اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں، وہ خدا کے وفادار بندے ہیں۔ وہ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ ابلیس کے طریقے کو اختیار کریں اور اپنی بڑائی کی خاطر دوسرے کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ خدا کے باغی لوگ ہیں۔ وہ ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر جلتے رہیں:

شیطان بولا: جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے، میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی تاک میں بیٹھوں گا۔ میں ان پر آؤں گا آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر۔

ان میں سے جو کوئی تیری راہ چلا تو میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا (اعراف ۱۸-۱۶)

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اصل سجدہ خدا ہی کو کرنا ہے۔ مگر دنیا کی زندگی میں وہ جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، ان کے مقابلہ میں بار بار اس پر کسی نہ کسی کا حق آتا ہے اور بار بار خدا کا حکم ہوتا ہے کہ یہاں تم اس ”آدم“ کے سامنے جھک جاؤ۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں اس کو کسی انسان کا اعتراف کرنا ہو، جہاں کسی انسان کے سامنے جھکنے کا سوال ہو وہاں فوراً

اس کے اندر ابلیس والی نفسیات جاگ اٹھتی ہیں۔ ”میں اس سے بہتر ہوں، میں کیوں اس کے سامنے جھکوں؟“ یہ احساس، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ جس خدا کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے، اس خدا کے حکم کے باوجود ”آدم“ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا ناحق پر۔ جو شخص حق پر ہے وہ گویا دوسرے شخص کے لئے وقت کا ”آدم“ ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان اس صورت حال کا پیدا ہونا ہی خدا کا یہ حکم آجانا ہے کہ میرے بنائے ہوئے اس آدم کے سامنے میری خاطر جھک جاؤ۔ اب جو شخص اپنے حریف کے حق کو مانتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، اس نے فرشتوں کی پیروی کی۔ اور جس شخص کے لئے اس کی ”میں“ حق کے اعتراف میں مانع ہو جائے، جو اس ذہن کے تحت حق دار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے کہ میری پوزیشن مضبوط ہے، یہ شخص میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنا اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ خدا کے آگے سجدہ صرف اس شخص کا معتبر ہے جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بنائے ہوئے ”آدم“ کے سامنے بھی جھکنے پر راضی ہو جائے۔ جو یہ کہے کہ میں خدا کے لئے سجدہ کروں گا مگر آدم کے سامنے نہیں جھکوں گا، وہ ابلیس کا بھائی ہے۔ اس کے سجدہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس نے ”آدم“ کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے کبر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جو اپنے اندر کبر کی نفسیات کی پرورش کرے اس کا کوئی عمل خدا کبھی قبول نہیں کرتا۔

پہلے انسان (آدم) کا قصہ خدا کے سامنے براہ راست پیش آیا تھا۔ اب دنیا کی زندگی میں ہر آن یہ قصہ خدا کے غیب میں پیش آرہا ہے۔ آج خدا ہمارے سامنے عیناً موجود نہیں ہے۔ آج جو چیز خدا کی جگہ پر ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہے اور اسی کے ساتھ آدمی کا اپنا ضمیر ہے جو اندر سے اس کو آواز دیتا ہے ہر روز جب کسی انسان سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے اور یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے حق کا اعتراف کریں، خواہ یہ تقاضہ لفظی اعتراف کا ہو یا کسی عمل کا، اس وقت گویا خاموش زبان میں خدا کا حکم ہمارے پاس آجاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اس ”آدم“ کا جو حق تمہارے اوپر آتا ہے اس کو ادا کرو۔ بالفاظ دیگر، اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اگر لفظی اعتراف کا معاملہ ہے تو لفظوں میں اس کی صداقت کا اعتراف کرو۔ اگر عملی حق کا معاملہ ہے تو عملی طور پر اس کا حق ادا کرو۔ ایسے موقع پر جو لوگ خدا کی خاموش آواز پر کان لگائیں اور فوراً اپنے آپ کو اس کی تعمیل کے لئے پیش کر دیں، وہ امتحان میں سچے اترے۔ اور جو لوگ ”میرا درجہ بڑا ہے“ ”میں اس سے بہتر ہوں“ ”میں زیادہ طاقتور ہوں“ جیسی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں اور اپنے ”آدم“ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیں، وہ امتحان میں پورے نہیں اترے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فرشتوں والا انجام ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے ابلیس والا انجام انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے۔ مگر کوئی شخص حقیقتاً خدا کا ساجدہ بنا یا نہیں، اس کا امتحان اس کو ”آدم“ کے سامنے جھک کر دینا ہے۔ خدا کا ساجدہ اور عابد وہی ہے جو خدا کے

حکم کو مان کر اپنے حق دار انسان کے سامنے جھک جائے۔ جو شخص خدا کے سامنے سجدہ کرے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو اس کا حق نہ پہچانے اور گھمنڈ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے، وہ خدا کا ساجد بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کا خدا اس کے ساجد ہونے کا امتحان لے رہا تھا وہاں وہ اپنے آپ کو ساجد ثابت نہ کر سکا۔

خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے مقابلہ میں کسی کے اندر ”میں اس سے بڑا ہوں“ کی نفسیات نہیں ہوتی۔ جب کہ انسان کے مقابلہ میں طرح طرح کی نفسیاتی گریں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کسی انسان کا حریف نہیں۔ جب کہ ایک انسان بہت جلد دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں جھکنے کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی کی نفسیات احتیاج کی نفسیات ہوتی ہے۔ خدا صرف دینے والا ہے۔ اس کو کسی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ کبھی اچھے الفاظ، کبھی دوسرے کی حقانیت کا اعتراف، کبھی اس کا مافی یا مادی حق ادا کرنا، کبھی کسی کو افضل پا کر خود پیچھے ہٹ جانا اور اس کو آگے بڑھانا، کبھی کسی کی کمزوری پر قابو پالینے کے باوجود اس کی عزت کی خاطر اس سے درگزر کرنا۔ کبھی ایک شخص کی اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہوتے ہوئے انصاف کی خاطر چپ رہ جانا۔ کبھی سامنے کے ملنے ہوئے نفع کو چھوڑ کر صرف اصول کی خاطر بے نفع والے آدمی کا ساتھ دینا، غرض ہر بار جب کسی کے لئے دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کا سوال ہو تو یہ اس کو کچھ دینے کا سوال ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں حق و انصاف کا ردیہ اختیار کرنے کے لئے اس کو اپنی نفسیاتی گریہوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی حریف کی عزت کرتا ہے تو یہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں خدا کے سجدہ کے مقابلہ میں ”آدم“ کے آگے جھکنے کو کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بنا دیتی ہیں۔ مگر انسان کا اصلی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہی مقام ہے۔ یہی وہ اصل قربانی ہے جو ہر ایک کو اپنے خدا کی رضا کے لئے دینی ہے۔ جو اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ بظاہر خدا کو سجدہ کرنے والا ہو یا سجدہ نہ کرنے والا۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العالمین ہے۔ اس ذات کو پالینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ ”سجدہ“ ہے، مگر سجدہ اسی وقت حقیقی سجدہ بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تو واضح اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا اِجْد (Recipient) بن سکے۔ اس کے لئے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص سجدہ سے باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا، اس کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔

توحید کا تصور اسلام میں

کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے اپنے منصوبہ کے مطابق اس کو بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ جس طرح ساری کائنات خدا کی اطاعت کر رہی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا فرماں بردار بن کر زندگی گزارے۔ تمام انبیاء یہی بتانے کے لئے آئے اور کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ہر آن آدمی کو یہی سبق دے رہی ہے۔ یہ ہے اسلامی توحید اور اس مقالہ میں مجھ کو اسی نظریہ توحید کی وضاحت کرنی ہے۔

”کیا تمہیں شک ہے اللہ کے بارے میں جس نے زمین و آسمان کو پھاڑا (ابراہیم ۱۰) قرآن کا یہ ارشاد بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقتاً وہ سوال کا جواب ہے۔ اس آیت میں خاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ وجود خداوندی کے حق میں ایک قطعی دلیل ہے جس کو دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ”کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا (انبیاء ۳۰) اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا موجودہ دائرہ (Radius) کم از کم دس ہزار ملین سال نور ہے۔ فلکیاتی مطالعہ نے بتایا ہے کہ کائنات ایک حالت پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ یکساں رفتار سے اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری میں کسی وقت کائنات سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ فلکیات دانوں کے خیال کے مطابق ابتداء پوری کائنات ایک بڑے ایٹم (Super Atom) کی صورت میں تھی۔ اس کے تمام اجزاء بے حد قوت کے ساتھ اندر کی طرف کھینچے ہوئے تھے۔ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے اس ابتدائی مادہ میں ایک دھماکہ یا اخراج طاقت (Energy Release) کا واقعہ ہوا جس کے نتیجے میں سپرائٹم کے اجزاء اپنے مرکز سے ٹوٹ کر اپنے چاروں طرف پھیلنے لگے تاکہ موجودہ کائنات کو وجود دے سکیں۔ سپرائٹم کے اندر اس وقت جو اسباب کام کر رہے تھے وہ تمام تر صرف اندر کی طرف کھینچنے اور سمٹنے کے تھے۔ اپنے ذاتی قانون کے برخلاف اس کے اجزاء کا باہر کی طرف سفر شروع کرنا لازماً کسی خارجی طاقت کی مداخلت ہی سے ہو سکتا تھا۔ یہ واقعہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کائنات کے ماسوائے آزاد ہستی کا وجود تسلیم کریں جو تمام طاقتوں کی مالک ہے اور جس نے اپنے شعوری عمل سے ابتدائی مادہ کے اندر یہ غیر معمولی حرکت پیدا کی۔

”زمین و آسمان میں اگر ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو ضرور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا (انبیاء ۲۲) قرآن کے یہ الفاظ اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ مافوق طاقت صرف ایک ہے، کئی نہیں۔ تمام طبیعی علوم حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ پوری کائنات ایک ہی قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو قوانین زمین پر کام کر رہے ہیں، وہی نہایت صحت کے ساتھ اجرام سماوی میں بھی کار فرما ہیں۔ یہی یقین تھا جس نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ کھربوں ڈالر خرچ کر کے خلائی مشینیں بنائے اور ان کو چاند اور مریخ پر بھی اپنے اندازہ کے مطابق اتار سکے۔ اگر ساری کائنات ایک قانون کے تحت مکمل صحت کے ساتھ عمل نہ کر رہی ہو تو زمین پر

گئی ہوئی، ہماری دور بینیں وسیع کائنات میں آٹھ ہزار ملین سال نور تک نہ ”دیکھ“ سکیں۔ ہمارے طبیعی علوم اپنا مکمل اپنی تمام اہمیت کھودیں۔ کائنات کا اس قدر درست طور پر ودھائی حالت میں ہونا بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک خدا کے کنٹرول میں ہے۔ اگر وہ کئی خداؤں کے کنٹرول میں ہوتی تو یقیناً اس میں انتشار برپا ہو جاتا۔ مختلف خداؤں کی کشمکش میں وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ زمین پر ایک قانون کی حکمرانی ہوتی اور سیاروں پر دوسرے قانون کی۔

”اللہ نے پیدا کی ہر چیز اور پھر ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر کر دیا (فرقان ۲) طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ آئن ریسرچ (پروفیسر طبیعیاتی ریاضیات کوئن میری کلج لندن) کے الفاظ میں ”کائنات تعجب خیز حد تک یکساں (Uniform) ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تخلیقی اعداد (Arbitrary Numbers) پر مشتمل ہیں۔ جیسے الیکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ (Mass) سے، جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تخلیقی طور پر (Arbitrarily) انہیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے“ (سنڈے ٹائمز لندن ۴ دسمبر ۱۹۷۷) یہ واقعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ کائنات ہر آن ایک زبردست ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ جو خدا کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا حکمراں بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ”خدا اگر ہے تو ہم کو نظر کیوں نہیں آتا“ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چیزوں کو دیکھے بغیر مانیں۔ یہ صرف خدا کے عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ ہم جس کائنات میں ہیں اور جس کو ہم بہر حال مانتے ہیں، اس میں بے شمار چیزیں ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کو ماننے پر مجبور ہیں۔ خدا کے سوا موجودہ کائنات کو بھی ہم ایمان بالغیب کا طریقہ اختیار کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر ایٹم میں کئی قسم کے ذرات (Particles) تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نیوٹرینو (Neutrino) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ذرہ میں کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مادہ (Mass) بھی نہیں ہوتا۔ گویا وہ ایک لاشے وجود ہے۔ ایک سائنس دان کے الفاظ میں:

Neutrino is a tiny bundle of nothing (3.1.1979)

نیوٹرینو لاشے کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہے۔ اس لاشے کا وجود کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم میں بعض ایسے خاص ظاہر ہوتے ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ ایٹم کے ڈھانچہ میں ایک غیر ذرہ (Non-Particle) کا وجود تسلیم کیا جائے۔ اس مفروضہ نیوٹرینو کے عجیب و غریب اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی مادی جسم سے بغیر روک ٹوک گزر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سفر میں پورے کرہ ارض کو اس کے اندر سے پار کر سکتا ہے۔ نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو انسانی استعمال میں لانے کے لئے امریکہ میں تجربات ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو قابل استعمال بنایا جاسکا تو پیغام رسانی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔

کائنات میں کسی چیز کو "دیکھنا" خالص علی طور پر اس قدر ناممکن ہے کہ سائنسی فلاسفہ کے درمیان خود اس امر میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کائنات کو ایک خارجی (Objective) واقعہ قرار دیں یا محض ایک ذہنی یا داخلی (Subjective) طور پر محسوس کی جانے والی چیز۔

خدا کو ماننا کبھی انسان کے لئے اتنا مشکل نہیں رہا ہے جتنا خدا کا صحیح تصور قائم کرنا۔ تمام معلوم زمانوں سے انسان خدا کو ماننا رہا ہے اور آج بھی کمرہ ارض کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے۔ مگر اصل کمی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود لوگ اس کے ساتھ ایسے عقیدے جمع کر لیتے ہیں جس سے ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو جاتا ہے۔ کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی ایسی تعبیر کی کہ خدا کا کوئی علیحدہ اور مستقل وجود ہی مشتبہ ہو گیا۔ کسی نے خدا کو مانا مگر اسی کے ساتھ اس کے ایسے شرکار یا مقربین بارگاہ فرض کر لئے جس کے بعد خدا کی خدائی بے معنی ہو کر رہ گئی۔

خدا کے معاملہ میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ ہمیشہ صرف ایک رہی ہے۔ کائنات کے معلوم واقعات پر خدا کو قیاس کرنا۔ انسان کے یہاں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ بیٹے بیٹیاں ہوں گی۔ اور اس طرح ایک مقدس خدائی خاندان تیار ہو گیا۔ دنیا کے بادشاہوں کے یہاں کچھ سرکاروں لوگ ہوتے ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے یہاں بھی کچھ مقرب لوگ ہیں جن کو اس نے اختیار دے رکھا ہے اور جن کی باتوں کو وہ سنتا ہے۔ اس طرح خاصان کائنات کا ایک قبیلہ تیار ہو گیا۔ دنیا میں بہت سی طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مثلاً سورج، ستارے، دریا وغیرہ۔ فرض کر لیا گیا کہ یہ سب خدائی میں شریک ہستیاں ہیں اور بڑے خدا کے ساتھ مل کر خدائی کو چلا رہی ہیں۔ اس طرح خدا کا معاملہ ایک قسم کا "مشترک کاروبار" کا معاملہ بن گیا، وغیرہ

منظا ہر پرستی کی یہی قسم تھی جس نے فلسفیانہ ذہنوں میں پہنچ کر وحدت وجود کی صورت اختیار کی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کائنات ہے جو انسان سے لے کر ستاروں تک بے شمار چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اس تنوع میں وحدت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مطلق خدا ہے جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح خدا کا تصور ایک ایسے مجرد خیال کی صورت میں ڈھل گیا جس کی اپنی علیحدہ کوئی ہستی نہ ہو۔ ہر چیز اسی سے نکلتی ہو اور ختم ہو کہ دوبارہ اس میں مل جاتی ہو۔ اسی تصور نے "انسانی خداؤں" کا عقیدہ پیدا کیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ کچھ لوگ اپنی ریاضتوں سے اپنی دنیوی حیثیت کی اس طرح نفی کر لیتے ہیں کہ وہ جیتے جی خدا سے مل جاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں اس خدا کا جزر بن جاتے ہیں جس کا جزر دوسرے لوگ مرنے کے بعد، ان کے عقیدہ کے مطابق، بننے والے ہیں

اسلام نے خدا کے تصور سے ان تمام الحاقات کو جدا کیا۔ اس نے بتایا کہ اس طرح کا ہر اضافہ دراصل خدا کے عقیدہ کی نفی ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہر لحاظ سے یکتائی کی صفت رکھتا ہو۔ جو اپنی ذات و صفات میں اشتراک

کی تمام قسموں سے پوری طرح پاک ہو۔ ”کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ اس کے اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہیں ہے اس کے برابر کوئی (اخلاص)

توحید کی عملی اہمیت

اسلام میں توحید کا عقیدہ ہیگل کے فلسفہ کی طرح محض ایک مجرد تصور (Abstract Idea) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی سے اس کا نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک وہی شخص موجد ہے جو وحدت فکر کے ساتھ وحدت کردار کا بھی حامل بن جائے۔ اسلامی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق ایک ہے اسی طرح اس کا مالک بھی ایک ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح وہ ہستی بھی وہی ایک ہے جس کے آگے انسان جواب دہ ہے اور اپنے عمل کے مطابق جس کے یہاں سزا یا جزا پانے والا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ بھی، بالواسطہ طور پر، عقیدہ توحید ہی کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی ظہور کو مانے بغیر جس طرح خدا کا عقیدہ بے معنی ہے، اسی طرح خدا کے محاسب اور مجازی ہونے کی حیثیت کو جب تک تسلیم نہ کیا جائے، خدا کی یکتائی کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔ موجودہ کائنات اپنی اتھار حکمتوں کے ساتھ خدائے وحدہ لا شریک کی قدرت کاملہ کا ایک ظہور ہے۔ آخرت کا عالم اسی ظہور خداوندی کی تکمیل ہے۔ موجودہ دنیا وحدت الہی کا غیبی ظہور ہے، آخرت کی دنیا وحدت الہی کا شاہداتی ظہور۔ موجودہ عالم میں توحید ایک غور و فکر کا موضوع نظر آتی ہے، آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں توحید ایک ایسا قائم شدہ واقعہ بن جائے گا جس کو ماننا اسی طرح ہر ایک کے لئے ضروری ہوگا جس طرح آج سورج کو ماننا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مانے مگر خدا کی یکتائی کے اس ظہور کو تسلیم نہ کرے جو آخرت کی صورت میں سامنے آنے والا ہے تو اس کا عقیدہ توحید ناقص ہے۔ وہ ایک فلسفی موجد ہو سکتا ہے مگر اس کو اسلامی موجد کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔

”خدا ایک ہے“ یہ صرف ایک گنتی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام معلوم اور نامعلوم حقائق کی تشریح کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا ہو یا روحانی دنیا، حال کا معاملہ ہو یا مستقبل کا معاملہ، دنیا کے مسائل ہوں یا آخرت کے مسائل، تمام چیزیں اس وقت تک ناقابل فہم ہیں جب تک ان کو ایک فکری وحدت کی حیثیت نہ دے دی جائے، جب تک وحدت خداوندی کے ساتھ ان کی نسبت کو معلوم نہ کر لیا جائے۔ خدا کی یکتائی کی دریافت تمام حقائق کی مرکزی وحدت کی دریافت ہے۔ وہی توحید توحید ہے جو ہمارے اوپر حقائق کی ابدی معنویت کو واضح کر دے۔ جو نظریہ حقائق کی معنویت کو بحیثیت ایک کل کے واضح نہ کرے وہ خواہ اور جو کچھ ہو مگر اسلامی نقطہ نظر سے اس کو توحید نہیں کہا جاسکتا۔ خدا کی وحدت کو پانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ اسی کے ساتھ انسان اور کائنات کی وحدت کو پانے کے ہم معنی بن جائے، وہ ایک ایسے فکر کا درجہ حاصل کرے جہاں تمام تضادات ختم ہو جائیں اور صرف وحدت ہی آخری حقیقت کے طور پر باقی رہ جائے۔ ڈارون نے خالق (Creator) کا وجود تسلیم کیا ہے۔ مگر وہ یہ دریافت نہ کر سکا کہ خالق ہے تو اس کے اور انسان کے درمیان نسبت کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے نظریہ کے بطن سے تاریخ کا سب سے زیادہ شدید

الحاد برآمد ہوا۔ توحید کے عقیدہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ضروری ہے کہ توحید کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ وہ ہم کو توحید اور انسان کے درمیان نسبت کی دریافت تک پہنچا سکے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ مطالعہ ادھورا رہیگا بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ سچائی کے مسافر کو اٹھی سمت میں کسی مقام پر پہنچانے والا بن جائے۔

توحید کا عقیدہ اور انسان

کائنات جس طرح مکمل طور پر اپنے خالق اور مالک کے تابع ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے جو کائنات کا صرف ایک حقیر حصہ ہے۔ انسان کے لئے درست طرز عمل صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرے اور خدا کی اطاعت کو قبول کر کے بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ خدا جس طرح ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح انسان کے معاملات بھی اسی وقت سدھر سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو خدائی کنٹرول میں دے چکا ہو۔ کائنات کی صحت کارکردگی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا راز بھی یہ ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے۔

توحید تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ توحید دنیا میں قائم نہ ہو۔ توحید کیا ہے۔ اس حقیقت واقعہ کا تحقق کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کو سنبھالنے والا اور ہر قسم کی قوتوں کا واحد مالک صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو اس کائنات میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک سارا عالم اس حقیقت توحید کی براہ راست گرفت میں ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مالک الملک کے زیر انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اپنی تمام دستوں کے ساتھ ٹھیک دیا ہی ہے جیسا کہ فی الواقع اس کو ہونا چاہئے۔ اس کی کارگزاری میں آج تک کسی ادنیٰ نقص کا مشاہدہ نہ کیا جاسکا۔ وہ اتنی کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی اس کی رفتار میں ایک سکند کا فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ زمانہ میں خدا کے وجود کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سب سے اہم وہ ہے جس کو نقص

کا مسئلہ (Problem of Evil) کہا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کائنات میں ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو کسی حکمت والے خدا نے بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص نے یہ مثال دی ہے کہ زمین کی قوت کشش (Force of Gravity) اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ چند میٹر کی بلندی سے گرنے میں آدمی کا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر قوت کشش کم ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ مگر اس قسم کی بات صرف کمتر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے والا یہ بھول گیا کہ گرنا تو ایک حادثہ ہے جو معمول کے خلاف کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن اگر زمین کی قوت کشش کم ہوتی تو اس پر معمول کی زندگی ہی درہم برہم ہو جاتی۔ انسان مضبوطی کے ساتھ زمین پر قائم نہ رہ سکتا، ہماری ریلیں بیڑیوں پر نہ دوڑ سکتیں، ہمارے مکانات اور کارخانے اکھڑ جاتے، پانی زمین پر نہ ٹھہر سکتا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو بعض لوگوں نے نظام فطرت کا نقص سمجھا ہے وہ نظام فطرت میں اعتدال و توازن کا ثبوت ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ ناقابل جلیغ حد تک صحیح ہیں "اللہ نے بنائے سات آسمان

اوپر تلے۔ تم اللہ کے اس بنانے میں کوئی فرق نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی مظل دکھائی دیتا ہے۔
 بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمہاری نگاہ عاجز ہو کر اور تھکی ہوئی تمہاری طرف لوٹ آئے گی (ملک)

کائنات کا اس طرح بے عیب اور خالی از نقص ہونا اس لئے ہے کہ وہ براہ راست خدا کے کنٹرول میں ہے۔ وہ خدا کی صفات کا مادی ظہور ہے۔ مگر انسانی دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اینٹن چیخوف نے صحیح کہا ہے کہ

”یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے“ انسان ساری معلوم کائنات میں واحد مخلوق ہے جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عداوت کرتا ہے (بقرہ ۳۶) وہ زمین پر اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے (اعراف ۵۶) وہ ایسی کارروائیاں کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کھیتیاں اور نیلیں برباد ہوں (بقرہ ۲۰۵)۔ دو دنیاؤں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ کائنات براہ راست اللہ کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ وہ ویسی ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسی کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادہ کے تحت صحیح یا غلط راستہ پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کی مرضی کی پابند ہے، اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے، اس لئے اس کے سارے معاملات میں فساد اور بگاڑ برپا رہتا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو ساری تاریخ میں درست ثابت کیا ہے جو انھوں نے اس کی پیدائش کے وقت خدا کے سامنے ظاہر کیا تھا: ”کیا تو ایسے لوگوں کو زمین میں اختیار دے رہا ہے جو وہاں فساد کرے اور خون بہائے (بقرہ ۳۰)

یہ آزادی جو انسان کو حاصل ہے، یہ مطلق آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے (ملک ۲) کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پا کر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے لوائے۔ اور ان لوگوں کو تنہا ہی کے گڑھے میں ڈال دے جو آزادی پا کر بگڑ گئے (انفال ۳۷) دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام بھی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ (مریم ۴۰) اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (آل عمران ۱۷۹) اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے، جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے، وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھہریں گے کہ وہ اللہ کی دنیا کے شہری بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث

قرار پائیں گے (انبیاء ۱۰۵) اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کر کے دور پھینک دیا جائے گا۔

قرآن اور کائنات

آنے والی جنتی دنیا کا شہری بننے کے لئے کس قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں، اس کے جواب کو خدا نے مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کو انتہائی واضح طور پر بتا دیا ہے۔ بولنے والی زبان میں یہ جواب قرآن میں موجود ہے اور خاموش زبان میں وہ کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ توحید کو انسانی زندگی میں قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی اسی آفاقی دین کو اپنالے جس کو ہمارے گرد و پیش کی ساری کائنات اپنالے ہوئے ہے۔ ”کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے“ (آل عمران ۸۳) قرآن کے اس بیان کے مطابق کائنات بالفعل اس دین توحید کو اپنالے ہوئے ہے جس کو اپنانے کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات دین توحید کا عملی نمونہ ہے۔ کائنات میں ہم اس دین کو ”دیکھ سکتے ہیں جس کو ہم خدا کی کتاب میں ”پڑھ“ رہے ہیں۔ توحید کے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کائنات کا جو نقشہ بنا ہے اس کے بعض پہلوؤں کو ہم یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

کامل سپردگی — کائنات کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مکمل اطاعت کر رہی ہے (فصلت ۱۲) زمین، سورج اور تمام ستارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وسیع خلا میں گھوم رہے ہیں۔ مگر کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی ان کی گردش میں ایک سکنڈ کافرق نہیں آتا۔ ہر چیز کا جو وظیفہ مقرر ہے، انتہائی صحت کے ساتھ وہ اس کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی کامل سپردگی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے ذاتی ارادہ کو مکمل طور پر خدا کے تابع کر دے۔ وہ وہی کرے جو اس کا مالک اس سے چاہتا ہے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں، اس کی آنکھ اور زبان، اس کا دل اور دماغ سب اللہ کے آگے اس طرح جھکے ہوئے ہوں کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ان سے سرزد نہ ہو۔

عبادت الہی — قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت اور تسبیح کر رہی ہے (نور ۴۱) چڑیاں جب درخت کی ہری بھری شاخوں پر بیٹھ کر چھپاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق اور رب کی تعریف کے نغمے گارہی ہیں۔ کھڑا ہوا درخت جب اپنا سایہ زمین پر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سجدہ میں گر گیا ہے۔ رات کی تاریکی کے بعد صبح کو جب سورج اپنی حسین کرنیں زمین پر پھیلاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: ”پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام روشنیوں کا مین سوچ ہے۔ اگر وہ اس مین سوچ کو بند کر دے تو ساری کائنات میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے“ اسی عبادت کا مطالبہ انسان سے بھی ہے۔ اس کو بھی یہی کرنا ہے کہ اپنے رب کی حمد و تسبیح کرے، اس کی خوبیوں اور کمالات کے احساس سے اس کا دل سرشار رہے، اس کی یاد اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے، اس کی عبادت گزار می کو وہ اپنی زندگی کا مستقل مشغلہ بنائے۔

قابل پیشین گوئی کردار — کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اتنی صحت کے ساتھ حرکت کرتی ہے کہ مستقبل کے واقعات کا پیشگی اندازہ کیا جاسکتا ہے (یونس ۵) وہ مکمل طور پر قابل پیشین گوئی (Predictable) ہے۔ یہی چیز انسان سے بھی اس کی زندگی میں مطلوب ہے۔ انسان کو اتنا پابند اور اتنا ذمہ دار ہونا چاہئے کہ پیشگی طو پر یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کس موقع پر اس کی طرف سے کس قسم کا رد عمل ظاہر ہوگا۔ کوئی معاملہ کرتے وقت پہلے سے یقین کیا جاسکے کہ کون سا رویہ اس کی طرف سے سامنے آئے گا۔ اس کے قول پر اسی طرح بھروسہ کیا جاسکے جس طرح اپنی گھڑیوں کو درست کرنے کے لئے ہم سورج کی رفتار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

توافق — کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام اجزاء، حدود و جہ توافق (Harmony) کے ساتھ عمل کرتے ہیں (یونس ۴۰) سورج اور چاند کبھی ایک دوسرے کے حریف نہیں بنتے۔ ستاروں اور ستاروں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور دھوپ اور مٹی سب آپس میں کامل ہم آہنگ ہو کر کام کرتے ہیں۔ تفسیراً ایک سو عناصر اور ان سے بنے ہوئے بے شمار مادی مجموعے اس قدر متوافق طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ ان میں کبھی باہمی آدینرش کا مشاہدہ نہیں کیا گیا۔ اب انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ باہمی کش مکش سے مکمل طور پر بچتے ہوئے اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے کرائے بغیر اپنا فریضہ حیات پورا کرے۔

نتیجہ پسندی — کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ہمیشہ ایک مفید انجام کی طرف جاتی ہیں (رعد ۱۷) زمین کی گردش، رات دن کا آنا جانا، بارش کا برسنا اور موسموں کا بدلنا، اور دوسری تمام سرگرمیاں نتیجہ پسند (Result Oriented) ہیں۔ سب کی سب نتیجہ خیز رخ پر سفر کرتی ہیں۔ فطرت کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کبھی کسی غیر مفید انجام پر ختم نہیں ہوتی۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو ہمیشہ نتیجہ رخی، بالفاظ دیگر مفید انجام کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر ایسی سرگرمی سے اس کو مکمل طور پر دور رہنا چاہئے جو عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ برآمد کرنے والی ہو۔

ارتقائی طریقہ — کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھلانگوں میں سفر نہیں کرتی بلکہ ارتقائی انداز میں واقعات کو ظہور میں لاتی ہے (ابراہیم ۲۷) درخت اچانک طلسماتی طور پر زمین کے اوپر کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ طویل مدت کے اندر تدریجی طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ انسان کو بھی اسی طریقہ کی پیروی کرنی ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تدریجی اور ارتقائی طور پر نتائج حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے نہ کہ چھلانگ لگا کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یکسانیت — کائنات کی چیزوں میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں۔ وہ اندر اور باہر یکساں ہیں۔ سورج اپنی ذات میں جیسا ہے، ٹھیک اسی شکل میں وہ دوسروں کے سامنے بھی طلوع ہوتا ہے۔ یہی بات انسان سے قول و عمل کی یکسانی کی صورت میں مطلوب ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جو اس کے دل میں ہے وہی وہ زبان پر لائے۔ جیسا کچھ وہ عمل میں ہے ویسا ہی لفظوں میں بھی اپنے کو ظاہر کرے۔ اس سے کسی کو منافقت یا دوغلی کا تجربہ ہرگز نہ ہو۔

خدائی اخلاقیات کا ظہور کائنات میں

حقیقت یہ ہے کہ حکمت و معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے وہی واقعہ انسان کو اپنی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے اپنی کائنات میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو اپنی زندگی میں اخلاقی اعتبار سے بر رویے کا لانا ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز صید (لوہا) کی شکل میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز تھری زمین سے چشمہ کی صورت میں بہ نکلتی ہے، وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز آبل تو این کی صورت میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر خوش معاشی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر کھربوں ستاروں کی ایک کہکشاں مسلسل حرکت کرتی ہے۔ مگر اس کے ستاروں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ایک کہکشاںی جھڑپ حرکت کرتا دوسرے کہکشاںی جھڑپ میں داخل ہوتا ہے اور نہایت تیز سفر کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ مگر دونوں جھڑپوں میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسانی مجموعے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ مگر ان میں کبھی ایک دوسرے سے نزاع اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ ”جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو“ کائنات میں کوئی چیز کسی کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری ایک سوئی کے ساتھ صرف اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس شکل میں مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی کارروائیاں کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں دوبارہ گردش (Recycle) کا اصول کارفرما ہے۔ پتی درخت سے گھر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھا دین جاتی ہے۔ فصلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے لگیں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پانی بھاپ بن کر اٹتا ہے اور اس کے بعد پھر سمندر میں واپس آ جاتا ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کا خرچ کیا ہوا پیسہ دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی جوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے ثمرات کا تحفہ دے۔ میدانی علاقوں میں پانی زمین کے نیچے ملتا ہے اس لئے میدانی درخت نیچے گہرائی میں اپنی جڑیں لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پہاڑی ڈھلوانوں پر پانی صرف اوپری سطح پر ملتا ہے، اس لئے پہاڑی درخت اپنی جڑیں اوپر اوپر پھیلاتے ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں حالات سے مطابقت (Adjustment) کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ حالات سے لڑنے کا۔ کائنات ذرہ سے لے کر ستاروں تک بے حد تیز سفر میں مصروف ہے۔ وہ ہر آن ایک بہت بڑے کارخانہ کی طرح کام کر رہی ہے۔ مگر اس میں کہیں بھی شور سنائی نہیں دیتا۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ خاموش جدوجہد کا طریقہ اپنائے، شور و غل کی سیاست چلانے سے مکمل پرہیز کرے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار

کام ہو رہے ہیں۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ اس دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پھاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تو واضح اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔ — نماز اسی قسم کی زندگی کی ایک علامتی تصویر ہے جو روزانہ پانچ وقت خدا کے وفادار بندوں پر فرض کی گئی ہے۔

کائنات میں ہر آن جو سرگرمیاں جاری ہیں وہ خاموش زبان میں پکار رہی ہیں کہ خدا کی دنیا میں کون قیمت والا ہے اور کون بے قیمت ہے۔ وہ لوگ جن کو صرف ظاہری مفاد متحرک کر سکتا ہو (خواہ وہ روپیہ پیسہ کا مفاد ہو یا عزت و شہرت کا مفاد) وہ اس غیر معاوضہ طلب دنیا میں بالکل بے قیمت ہیں۔۔۔ کائنات میں ظاہری کوئی حذائی اخلاقیات کے معیار پر وہ پورے نہیں اترتے۔ خدا کی دنیا میں وہی لوگ قیمت رکھتے ہیں جو خالص صداقت کی خاطر متحرک ہوئے ہوں۔ جو تسکین ذات سے اوپر اٹھ کر عمل کا ثبوت دینے والے ہوں۔ جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر کام کریں۔ آئندہ آنے والے جنتی دور میں وہ تمام لوگ خدا کی دنیا سے باہر دھکیل دیئے جائیں گے جنہوں نے قریبی مفاد (عاجلہ) کے لئے سرگرمیاں دکھائی تھیں۔ اور خدا کی یہ حسین اور خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا ہمیشہ کے لئے صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو دیر میں آنے والے فائدہ (آخرت) کے لئے سرگرم عمل رہے تھے۔ جو سامنے کی چیزوں سے اوپر اٹھ کر ”غیب“ کی طرف اپنی توجہ لگائے ہوئے تھے :

”اور انہوں نے قدر نہ پہچانی اللہ کی جیسی کہ قدر ہے اس کی۔ حالاں کہ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بہت اوپر ہے ان کے سر کے۔ اور اس روز پھونک مارا جائے گی صورتیں۔ پھر تمام آسمان اور زمین والے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ صرف وہی بچے گا جس کو خدا چاہے۔ پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور سب کے اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ٹھیک ٹھیک سب کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ کبھی کے اوپر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ہر شخص کو پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا تھا۔ اور اللہ کو خوب خبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور انکار کرنے والے گروہ درگروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان سے کہیں گے: کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغام پہنچانے والے نہ آئے تھے جو تم کو خدا کی باتیں سناتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ جواب دیں گے ہاں۔ مگر عذاب کا وعدہ منکر دوں کے اوپر بڑا ہو کر رہا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں پڑے ہو۔ کیسا برا ٹھکانا ہے تم کو کرنے والوں کا۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ درگروہ جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھولے جائیں گے تو جنت کے فرشتے کہیں گے، سلامتی ہو تم پر۔ خوش رہو۔ جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اہل جنت کہیں گے۔ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنے والدہ کو سچا کر دیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تو دیکھے گا فرشتوں کو کہ گھیر رہے ہوں گے عرش کے گرد پاکی بولتے ہوئے اپنے رب کی خوبیوں کی۔ اور تمام بندوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور یہی بات ہوتی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا“ (زمر۔ آخر)

کائنات میں انتہائی وسیع پیمانہ پر ہر آن یہ دکھایا جا رہا ہے کہ آئندہ بننے والی معیاری دنیا (جنت) میں بسانے کے لئے خدا کو کس قسم کے شہری درکار ہیں۔ اس کو وہ انسان درکار ہیں جو کائناتی اخلاقیات کے معیار پر پورے اتریں۔ وہ اس دین کو اختیار کریں جو اس نے لفظی طور پر اپنی کتاب میں اور عملی طور پر اپنی کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس سے سبق نہ لیں اور خود اپنے گھڑے ہوئے راستوں پر چلتے رہیں، وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ خدا کے بتائے ہوئے ”دین“ کے سوا جو دین بھی وہ اختیار کریں گے وہ آخرت میں بالکل بے قیمت ہو گا۔ کیوں کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کا انکار کیا (کہف ۱۰۵) جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے خدا کی نشانیاں کو نہ دیکھیں اور کان رکھتے ہوئے خدا کی آوازوں کو نہ سنیں، وہ خدا کے نزدیک جانور سے بھی زیادہ بدتر ہیں (انفال ۲۲) آئندہ بننے والی دنیا میں ان کا جو انجام ہو گا اس کا اعلان خدا کی کتاب میں ان لفظوں میں کر دیا گیا ہے:

اور جس نے منہ پھیرا میری نصیحت سے تو اس کے لئے (آخرت میں) تنگی کا جینا ہو گا۔ اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا میرے رب! تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا۔ میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہو گا کہ اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری نشانیاں۔ پس تو نے ان کو بھلا دیا تو اسی طرح آج تم کو بھلا دیا جائے گا۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جو حد سے نکل گیا اور یقین نہ لایا اپنے رب کی نشانیاں پر۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے۔

ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة
ضنكا ونحسرة يوم القيامة اعمى۔ قال
رب لم احشوتنى اعمى وقد كنت بصيرا۔
قال كذ لك اتتك آيتنا فنسيتها وكذ لك
اليوم تنسى۔ وكذ لك نجزي من اسرف
ولم يرم من بآيات ربه ولعدنا اب الاخرة
اشد وابقى (طہ ۲۴-۱۲۳)

نوٹ: یہ مقالہ سیمینار منوحدہ نغلق آباد نئی دہلی (۸ جنوری ۱۹۷۹) میں پڑھا گیا۔ سیمینار کا عنوان تھا:

خدا کی وحدانیت کے تصورات (Concepts of the Unity of God)

اسلام دین فطرت

عن ابی عبد الرحمن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: بُنی الاسلامُ علی خمسٍ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُهُ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتٰیَ الزَّکٰوةَ وَحَجَّ الْبَیْتِ وَصَوْمَ رَمَضَانَ (رواہ البخاری مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ گو اہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں (خمیس دعائم) پر کی گئی ہے (کتاب الصلوٰۃ محمد بن نصر المرزئی) ایک عمارت اپنی تفصیلی صورت میں بہت سے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر ساری عمارت جس چیز کے اوپر کھڑی ہوتی ہے وہ چند کھمبے (PILLARS) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے لئے بھی یہ پانچ چیزیں کھمبے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کمزور ہونے سے اسلام کمزور ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کی ہستی ایک زمین کی مانند ہے۔ اگر وہ اپنی اس "زمین" پر خدا کی پسند والی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ ان پانچ کھمبیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ قائم کرے۔ ان کھمبیوں کو گاڑے بغیر نہ فرد کی سطح پر اسلام کا ظہور ہو سکتا ہے اور نہ سماج کی سطح پر۔

اسلام آدمی کے اندر جو زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ایک لفظ میں عبادت یا خدا پرستی کی زندگی ہے۔ تاہم اپنی تفصیلی صورت میں وہ پانچ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ پانچ چیزیں پانچ رسمیات نہیں ہیں بلکہ پانچ اوصاف ہیں۔ یہ ان مطلوب چیزوں کا خلاصہ ہے جو ہمارا مالک ہماری زندگیوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ پانچ اوصاف آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو گویا اس کے اندر وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہو گئی جس کے بعد یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس ربانی کردار کا ظہور ہو جس کو اسلام ایک ایک شخص کی زندگی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمان کا مطلب خدائی حقیقتوں پر یقین ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بڑائی کے آگے اس طرح جھکے کہ اپنی بڑائی کا احساس اس کے اندر سے ختم ہو جائے۔ روزہ اللہ کے بھر دے پر صبر کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق پہچانے تاکہ خدا اس کو اس کے حصہ سے محروم نہ کرے۔ حج سے یہ مراد ہے کہ خدا کے بندے خدا کے گرد متحد ہو جائیں۔ یہ سب اپنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اوصاف ہیں نہ کہ محض خارجی مراسم۔ گویا کہ یقین، بے نفسی، صبر، حق شناسی اور اتحاد وہ پانچ صفاتی کھمبے ہیں جن کے اوپر اسلامی زندگی کا گھر بنتا ہے۔

۱۔ اللہ کو اپنا الہ بنانے کا اقرار اس کو اپنا سب کچھ بنانے کا معاہدہ ہے۔ یہ اللہ کو اپنے احساسات اور

جذبات کا مرکز بنانا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آدمی اپنی امیدوں اور تمناؤں، اپنے اندیشوں اور التجاؤں کا مرکز اللہ کو بنائے گا۔ وہ کہیں اور جینے کے بجائے اپنے رب میں جئے گا۔ آدمی کی امیدیں اور اس کے احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں، وہیں وہ آدمی جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور اپنے بال بچوں میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے معاش اور کاروبار میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مشاغل اور قیادتی مصروفیات میں جیتا ہے، کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جیتا ہے۔ غرض ہر آدمی کہیں نہ کہیں جی رہا ہے۔ مگر یہ تمام جینا جاہلیت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا حقیقتہً کوئی وجود نہیں۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے۔ وہ اس سہارے کو پکڑے جس کے سوا اس کا ثبات میں کسی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھر دسہ پر رے کے اور اسی کے بھر دسہ پر چلے۔ وہ اسی کے لئے بولے اور اسی کے لئے خاموشی اختیار کرے۔

ایمان کی مثال بجلی کی کرنٹ کی سی ہے۔ پاور ہاؤس سے بجلی کی کرنٹ جب کارخانہ میں پہنچتی ہے تو سارا کارخانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کی تمام کلیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی بندے کا اپنے رب سے ایمانی تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے اندر اچانک ایک نئی روشنی آجاتی ہے، اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ ایمان اس کے قلب کو گرمانے والا اور اس کی روح کو تڑپانے والا بن جاتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک نئی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ انسان جو پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، وہ دوبارہ ایمان کے کوکھ سے ایک نیا جنم لیتا ہے۔ وہ اب خدا سے الگ نہیں رہتا بلکہ خدا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو جسمانی طور پر وہ اس سے جدا رہتے ہوئے بھی حسیاتی طور پر وہ اس سے مل جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہی حال اللہ پر ایمان لانے والے کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی دستوں میں خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ طوفانوں کی قہرمانی میں اس کو خدا کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ پتھریوں کے چھپے میں اس کو خدا کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا نورانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ درختوں کو دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی تخلیقی کہانی سہ سبز صفحات کی صورت میں زمین کے اوپر پھیلا دی گئی ہے۔ ہوا کا جھونکا جب اس کو چھوتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا سے اتصال کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ غرض جو شخص خدا کا مومن بن جاوے وہ ہر آن خدا کے اٹھا ہنڈر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے۔ ہر تجربہ جو اس کے ساتھ گزرتا ہے وہ اس کو خدا سے ملانے والا بن جاتا ہے۔ وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا۔

اللہ پر ایمان ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ اسی نے سب کچھ بنایا ہے، اسی کے سہارے ہر چیز قائم ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ایمان آدمی کے اندر اس شعور کو زندہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے، ہر چیز میں

اس کو خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے اور ہر صلیب اس کو خدا کے ہاتھ سے ملی ہوئی چیز دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی حمد ہر آن اس کے اندر سے ابلتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کے لمحات غفلت کے لمحات نہیں ہوتے بلکہ ہوش مندی کے لمحات ہوتے ہیں۔ ہر موقع اس کے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا شام کو وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے اس کو گہری نیند آ جاتی ہے۔ صبح کو وہ تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو بے حساب احسان مندی کے جذبہ کے تحت اس کی زبان سے نکلتا ہے: خدا یا تیرا یہ احسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اگر آدمی پر نیند نہ آئے تو وہ پاگل ہو جائے اور چند دن کی زندگی بھی اس کے لئے محال ہو جائے۔ رات کی تاریکی کے بعد جب سورج نکلتا ہے اور دنیا کو روشن کر دیتا ہے تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: کیسی بابرکت ہے وہ ذات جس نے روشنی پیدا کی۔ اگر روشنی نہ ہو تو سارا عالم تاریکی کا حبیب سمندر بن جائے۔ جب اس کو بھوک لگتی ہے، وہ پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے تو اس کی پوری ہستی شکر کی کیفیت سے بھر جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ خدا اگر آدمی کے لئے کھانا اور پانی نہ آتا تو آدمی کا کیا حال ہوتا۔ اس کو چوٹ لگتی ہے تو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں تو وہ خدا ہی سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔ اس کو نفع ملتا ہے تو اس کو انسان کے اوپر خدا کی نوازشیں یاد آتی ہیں۔ اور اس کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کو وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ نعمتوں کا ملنا اس کو مغرور نہیں بناتا اور نقصان اس کے اندر بے صبری پیدا نہیں کرتا۔ کوئی عقیدت اس کے لئے خدا کی حریف نہیں بنتی۔ کوئی مصلحت اس کو خدا سے بے پروا نہیں کرتی۔ ایک شخص زمین اور دوسرے اجرام کی قوت کشش کو دریافت کرے یا کائناتی شعاعوں کو اپنے آلات کی مدد سے پائے تو یہ اس کے لئے محض ایک علمی یافت ہوگی۔ یہ پانے والے سے کسی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرے گی۔ مگر خدا کو پانے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کو پانا ایک ایسی ہستی کو پانا ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو حکمت اور طاقت کا خزانہ ہے۔ ایسے خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک عظیم الشان کائنات یوں ہی خاموش کھڑی رہے اور اس کی معنویت کبھی ظاہر نہ ہو، یہ ایک ایسی کائنات میں بالکل ناممکن ہے جس کا بنانے اور چلانے والا ایک عظیم اور عزیز خدا ہو۔ اس طرح اس کی ایمانی یافت اس کو اس یقین تک پہنچاتی ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ جب آدمی ان حقائق کو دیکھ کر جان لے جن کی بابت آج وہ نظر نہ آنے کی وجہ سے جھگڑ رہا ہے۔ پھر یہ یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس قسم کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور محاسب و مجازی طاقت کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے قیامت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی اس دنیا میں بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ اس دن کبھی مجھ سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام

حاصل کر لیں گے۔ خدا کا غیب میں ہونا خدا کے غیر وفادار بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد، ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر جنت میں خوشیوں اور لذتوں کی زندگی گزاریں گے۔

جب آدمی اس یقین تک پہنچتا ہے تو وہ خدا کی ہیبت سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے: ”خدا! مجھے اس دن رسوا ہونے سے بچا جب تو اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جب انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا۔ جب آدمی بالکل بے بس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوگا۔ جب تیرے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا۔“

خدا کو اللہ بنانے ہی کا ایک پہلو رسول کی رسالت کو ماننا ہے۔ جب آدمی خدا کو ایک زندہ اور باشعور سستی کی حیثیت سے پاتا ہے تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اندرونی فطرت سے اشارے ملتے ہیں۔ کائنات اپنی خاموش زبان میں کچھ پیغامات نشر کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے رب کے پیغام کو یقینی زبان میں پالے، وہ آنے والے دن سے پہلے اس دن کے معاملات سے باخبر ہو جائے۔ عین اس وقت اس کو پیغمبر کی آواز سنائی دیتی ہے: ”میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، اللہ نے مجھ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ میری طرف آؤ اور مجھ سے اپنے رب کے پیغامات معلوم کرو۔ جو انسان حقیقتاً طالب ہو، جو فی الواقع سچائی کی تلاش میں ہو، اس کے لئے اس آواز کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تعصب اور غفلت کے ان تمام پردوں کو پہلے ہی پھاڑ چکا ہوتا ہے جو آدمی کو گھیرے رہتے ہیں اور سچائی کی آواز کو اس کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچہ جس طرح اپنی ماں کی آواز کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ اس پیغام کو پہچان لیتا ہے جو پیغمبر کی معرفت اس کے رب کی طرف سے اس کو پہنچ رہی ہے۔ پیغمبر کی آواز اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوتی ہے جیسے پٹرول کی آگ یا سوکھی زمین میں بارش۔ اس کا پورا اندرونی وجود ربانی روشنی سے بھرک اٹھتا ہے۔ اس کی تلاش کی سوکھی زمین حق کی بارش کے ایک قطرہ کو جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے ساتھ اس کے پیغمبر کو پالیتا ہے اور پیغمبر کو پانے کے ساتھ اپنے خدا کو۔“

رسول کوئی فرشتہ یا کوئی غیر انسانی وجود نہیں۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور سارے انسانوں کی طرح ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا۔ خدا نے دیکھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کی فطرت پوری طرح زندہ ہے۔ جس کے قول و عمل میں تضاد نہیں۔ جس نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی عمر تک کبھی ایک بار بھی امانت کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ سچا ہے، وعدہ پورا کرنے والا ہے، وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتا ہے، وہ حق کے لئے اس سے زیادہ بے چین ہوتا ہے جتنا کوئی شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ خدا نے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خالص روح پائی جو حق کی امانت کا امین بن سکے۔ اس نے اس کے اندر وہ غیر مصلحت پرستانہ کردار پایا جو کسی ادنیٰ لچک کے بغیر ربانی ذمہ داری

کو ادا کر سکے۔ اس نے اس عربی انسان میں وہ طلب دیکھی جو اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ خدا کی الہامی امانت کی پوری قدر دانی کرے گا اور اس کو اسی طرح لے گا جس طرح اس کو لینا چاہئے۔ ان پہلوؤں میں یہ عربی انسان پالیس برس کی زندگی تک انتہائی مکمل ثابت ہوا۔ اس لئے خدا نے اس کو اپنے آخری اور عالمی پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا اور اس انسان کا ل نے اپنی نبوت کی ۲۳ سال کی زندگی سے ثابت کر دیا کہ خدا کا یہ انتخاب انتہائی درست تھا۔ اس انسان کا ل نے پیغمبری کی ذمہ داری کو اتنی معیاری صورت میں انجام دیا کہ اس سے زیادہ معیاری صورت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

پیغمبر کے ذریعہ ہم کو خدا کی وہ محفوظ کتاب ملی ہے جو اس کے اوپر فرشتہ کے ذریعہ آماری گئی اس کتاب میں وہ تمام چیزیں لکھی ہوئی صورت میں موجود ہیں جو اللہ کو ہم سے مطلوب ہیں۔ قرآن میں اللہ ہم سے انسانی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ پیغمبر نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کا بہترین اہتمام کر کے اس کو اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا اور ہم کو پوری طرح پہنچا دیا۔ پیغمبر نہ صرف خدائی الہام کو وصول کرنے والا تھا بلکہ اس نے کامل اور مکمل صورت میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اس طرح پیغمبر کی زندگی اس ربانی ہدایت کا عملی نمونہ بن گئی جو قرآن میں لفظوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ پیغمبر نے گھریلو زندگی بنائی۔ وہ بستی اور بازار میں لوگوں کے درمیان رہا۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے معاملہ کیا۔ اس کو فتح و شکست کے موافق پیش آئے۔ اس نے دعوت دی اور دعوتی مراحل سے گزرا۔ اس کو بھوک لگی اور اس نے چوٹ کھائی۔ اس نے مفلسی اور دولت مندی کے دن دیکھے۔ غرض ایک عام آدمی سے لے کر ایک نچ اور بادشاہ تک انسانی زندگی کے جتنے مختلف تجربات ہیں، سب اس پر گزرے۔ ہر جگہ اس نے ایک ربانی انسان کا رویہ اختیار کیا۔ اس طرح اس کی زندگی قیامت تک تمام انسانوں کے لئے مکمل نمونہ بن گئی۔ ہر وہ آدمی جو اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور اس کو ابدی باغوں والے گھر میں داخل کرے، اس کے لئے ایک ہی راہ ہے۔ وہ قرآن سے اللہ کا حکم معلوم کرے اور پیغمبر کی زندگی میں اس حکم کا عملی نمونہ دیکھے اور ان دونوں چیزوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں ہیں سب بھٹکنے کی صورتیں ہیں، نجات کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیغمبر کی زندگی ایک ایسی مکمل زندگی ہے جس میں چھوٹے لوگوں کے لئے بھی نمونہ ہے اور بڑے لوگوں کے لئے بھی۔

۲۔ اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز اپنی متعین شکل کے اعتبار سے یہ ہے کہ روزانہ دن رات کے درمیان پانچ وقت مقررہ انداز میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ یہ انداز جو رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، اتنا جامع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عبادتی انداز کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب وقت آتا ہے تو اذان کے ذریعہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت آگیا۔ اپنی فلاح کے لئے جمع ہو جاؤ۔ لوگ وضو کر کے اپنے پاکی کے احساس کو تازہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کو یاد کرتے ہوئے مسجد پہنچتے ہیں۔ وہاں سب مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کا ایک امام ہوتا ہے جس کی رہنمائی میں اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے

کہ اسی طرح سارے مسلمان خدا کے رسول کو اپنا مرکز اجتماع قرار دے کر اس کے گرد متحدہ زندگی گزاریں گے۔
 رکوع و سجود اور قیام و قعود کی مختلف حالتوں کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے۔ کبھی دست بستہ
 کھڑے ہو کر، کبھی جھک کر، کبھی نیاز مندانہ بیٹھ کر کبھی اپنے سر کو زمین پر رکھ کر خدا کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو تازہ کرتے
 ہیں۔ نمازیں قرآن کے حصے پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جہاں کہیں سے اور جتنا
 بھی پڑھئے، قرآن کی دعوت کا تعارف مل جاتا ہے۔ قرآن کا ہر صفحہ گویا قرآن کا خلاصہ ہے۔ اس طرح نمازیں اگرچہ
 بیک وقت قرآن کا مختصر حصہ پڑھا جاتا ہے مگر وہ اللہ کی پسند و ناپسند کو جاننے کے لئے ہمیشہ کافی ہوتا ہے۔
 اسی کے ساتھ نمازیں خدا کی حمد اور ذکر کے کلمات بولے جاتے ہیں، اس سے دعا کی جاتی ہے، رسول کے لئے اور
 تمام اہل ایمان کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ تمام انسانوں کو سلامتی بھیج کر کیا جاتا
 ہے۔ اس طرح اپنے مختلف اجزاء کے ذریعہ نماز ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو بیک وقت اللہ کی عبادت بھی ہے اور
 اللہ کے حکموں کی یاد دہانی بھی۔ وہ اہل ایمان کے لئے دینی غذا بھی ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اجتماعیت کا
 ذریعہ بھی۔ وہ اسلامی زندگی کا نشان بھی ہے اور نظم و ضبط کی تربیت بھی۔ وہ اللہ سے روحانی اتصال کا مقام
 بھی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت و عمل کا سبق بھی۔

نماز اپنی شکل کے اعتبار سے مخصوص عبادت کا نام ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے تواضع اور توجہ الی اللہ کا۔
 اپنے مقابلہ میں کسی کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آدمی زبان سے جو آخری کلمہ بول سکتا ہے وہ یہ کہ وہ کہے ”وہ سب سے
 بڑا ہے“ نمازیں بار بار یہ کلمہ (اللہ اکبر) خدا کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقابلہ میں خدا کی مطلق کبریائی کا
 سانی اقرار کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر کسی کی بڑائی کے اعتراف کی آخری صورت سجدہ ہے۔ سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت
 نہیں ہو سکتی جس سے آدمی دوسرے کی عظمت کا جسمانی اعتراف کرے۔ نمازیں بار بار خدا کے آگے سجدہ کر کے خدا کی
 بے مثال عظمتوں کا عملی اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانے کی سب سے زیادہ کامیاب بیعت
 جو تصور کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کا رخ پوری طرح اس کی طرف کر دے۔ نمازیں بیت اللہ کی طرف
 رخ کا اہتمام کر کے ظاہر کیا جاتا ہے کہ بندے نے اپنی زندگی کو خدا کی طرف موڑ دیا، اس نے اپنی زندگی کو اندر سے
 لے کر باہر تک خدائے (God-oriented) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ کے آگے بنیے کے اس جھکاؤ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صرف خدا کے سامنے جھکاؤ تک نہیں
 رہتی، وہ اس کی مستقل کیفیت بن جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرنے لگے، جو اللہ کے آگے جھک جائے۔ جو اللہ کے
 مقابلہ میں اپنے کو بے حقیقت بنا لے وہ بندوں کے سامنے آئے گا تو ناممکن ہے کہ یہاں اس کے رویہ میں اس کے
 عبادتی اثرات ظاہر نہ ہوں۔ وہ انسان کے آگے سجدہ میں نہیں گرے گا مگر وہ انسان کے مقابلہ میں گھٹن بھی نہیں
 دکھائی گا۔ وہ انسان کو ”تو بڑا ہے“ نہیں کہے گا مگر اپنی بڑائی کا سکھ اس پر قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ نماز
 میں اس کا سجدہ بنا بندوں کے مقابلہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ زمانہ میں اس کا خدا کی تابعداری کا اقرار کرنا

بندوں کے معاملات میں حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نمازیں اس کی رخ بندی بندوں کے معاملات میں اصولی پابندی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ وہ انسان جو خدا کے سامنے کامل بندگی کا اقرار کر کے مسجد سے نکلتا، وہ بندوں کے درمیان کامل اخلاق کا نمونہ بنا ہوا دکھائی دے گا۔ نماز کسی بندہ کے معاملات کو خدا کے ساتھ عجز کی بنیاد پر قائم کرتی ہے اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کو تواضع کی بنیاد پر۔

روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ نماز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔ رات کو تہجد کی نماز، کوئی غیر معمولی دفعہ پیش آنے کے وقت کی نماز، حاجت اور استخارہ کی نماز، اسی طرح جمعہ اور عیدین کی جماعت، جنازہ کی نماز جماعت، وغیرہ۔ یہ نمازیں اسی کیفیت کو مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوششیں ہیں جو پنج وقتہ نمازوں سے ہر روز مطلوب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر پوری طرح کسی کو مل جائے تو وہ اس کی پوری زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نیا کام شروع کرے تو دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے مدد کی درخواست کرتا ہے، وہ کسی مقام پر پہلی بار جائے تو وہاں وہ نماز پڑھ کر اپنے رب کی یاد کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو تو نماز پڑھ کر اپنے دل کی گہرے کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال بندوں سے تعلقات کے معاملہ میں بھی ہوتا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نماز اس کے ساتھ ایک خدائی تگراں کی طرح لگی ہوئی ہے۔ دنیا کی پھسلی ہوئی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زمین خدا کی مسجد ہے اور ہر جگہ اس کو اپنی عبادت گزاری کے تقاضے پورے کرنے ہیں

۳۔ اسلام کا تیسرا کچھ روزہ ہے۔ روزہ میں آدمی صبح کو فجر سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک نہ کوئی کھانے کی چیز کھاتا اور نہ پینے کی چیز پیتا۔ اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو چھوڑ کر وہ صبر درگتے برداشت کرنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے کی وجہ سے اس کو دن میں بھوک لگتی ہے۔ پیاس ستاتی ہے، اس کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کا نظام کپٹ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ناخوش گواہیوں کو جھیلتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی تکلیفوں پر قابو رکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی ہوتا ہے مگر پیاس کے باوجود وہ اس کو نہیں پیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کھانا ہوتا ہے مگر بھوک کے باوجود وہ اس کو نہیں کھاتا، اس طرح وہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرتا ہے کہ وہ ایک پابند اور ذمہ دار زندگی گزارے۔ وہ وہی کرے جو اس کو کرنا چاہئے۔ اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی قسم کی مشکل پیش آئے، ہر حال میں اصل مقصد حیات کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔

خدا نے دنیا کی زندگی میں بے حساب نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ مگر یہ نعمتیں خود بخود ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ آدمی کو ایک بے حساب قسم کا بے سجدہ جسمانی نظام دیا گیا ہے۔ ایک رگ میں

فرق آجائے تو سارے جسم کا توازن بگڑ جائے۔ دنیا میں دھوپ، ہوا، پانی اور لاتعداد دوسری چیزیں حیرت انگیز طور پر اس کے لئے کارآمد بنادی گئی ہیں۔ اگر ایک چیز بھی ان میں سے نہ رہے تو زندگی عذاب بن جائے۔ یہ تمام چیزیں بغیر کسی اکتسابی کوشش کے آدمی کو ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ روزہ میں انسان کو اس کی انتہائی بنیادی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے روکا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر خدائی نعمتوں کا شعور جگایا جاتا ہے۔ دن بھر کی بھوک، پیاس، تھکن اور بے آرامی کے بعد شام کو جب آدمی کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کو اپنی محتاجی اور خدا کی بے پناہ بخششوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اللہ کے شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس خدا نے ایسی نعمتیں دی ہیں، اس کے لئے اگر میں اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دوں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مومن کو جو زندگی گزارنی ہے وہ سرتاپا صبر کی زندگی ہے۔ اس کو اللہ کی جائزگی ہونی چیزوں تک اپنے کو محدود رکھنا ہے، اس کی ناجائزگی ہونی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ حق پرستانہ زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو ہتھ پونے اپنے فریضہ حیات کو پورا کرنے میں لگے رہتا ہے۔ اس کو دنیا کے نقصانات کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر جب کہ اس کے نفس کو چوٹ لگے، جب اس کے اندر کٹا ناپسندیدہ بات پیش آنے کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو، تو اس کو منفی رد عمل سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت مقاصد کے لئے وقف رکھتا ہے۔ یہ تمام چیزیں بے پناہ صبر و برداشت چاہتی ہیں۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اسلام کے راستہ کا مسافر نہیں بن سکتا۔ روزہ ہر سال اسی صبر کا سبق دیتا ہے۔ وہ ایک مہینہ تک صابرانہ زندگی کی مشق کرا کر آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں کو صبر کے ساتھ گزار سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو تمام عمر میرائی سے، منفی تدبیروں سے، بے صبری کے اقدامات سے، دوسروں کو ستانے سے، اللہ کے حرام کو حلال کرنے سے روزہ رکھ لینا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں ضروریات زندگی پر پابندی لگا کر اسی قسم کی ”روزہ دار“ زندگی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ روزہ اپنی شکل کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے لئے کھانا پانی چھوڑنا ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔

۳۔ اسلام کا جو تھارٹھن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی اور اپنی دولت سے ہر سال ایک مقررہ رقم (عام طور پر ڈھائی فی صد) اللہ کے نام پر نکالی جائے۔ اور اس کو دین کی ضرورتوں اور حاجت مندوں کے اوپر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ ایک قسم کی سالانہ یاد دہانی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنی کسی چیز کو خدا سے بچا کر نہ رکھے۔ دنیا میں آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے، اس کا اپنا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے زمین و آسمان کے اندر جو بے شمار اعلیٰ ترین انتظامات ہیں اگر وہ ساتھ نہ دیں تو آدمی نہ کوئی دانہ اگا سکے، نہ موشیوں کی پرورش کر سکے۔ نہ صنعتیں قائم ہو سکیں، نہ اور کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ انسان کے اپنے وجود سے

لے کر باہر کے عالم تک جو خدائی انتظامات ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر خدا واپس لے لے تو آدمی کی ساری کوششیں اور منصوبے اکارت چلے جائیں اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں۔

زکوٰۃ اسی حقیقت واقعہ کا مانی اعتراف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنے مال کو خدا کا مال سمجھے۔ اپنی کمائی میں خدا کا حق تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم کم سے کم کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ قانونی زکوٰۃ کی صورت میں آدمی ہر سال کم سے کم خدا کا حق نکالتا ہے اور اس کو جمع کر کے خدا کی مقرر کی ہوئی مدتوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس نکالنے میں آدمی کو نہ تو یہ اجازت ہے کہ وہ اس کو دوسروں کے اوپر احسان سمجھے اور نہ اس کو ایسا کرنا چاہئے کہ پانے والوں کو ذلیل کرے۔ اس کو اس جذبہ کے تحت دینا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہو۔ دوسروں کا حصہ ہے اور وہ اس کو حق داروں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ وہ اس لئے دوسروں کو کھلائے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو کھلائے، وہ اس لئے دے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو محروم نہ کرے۔

زکوٰۃ ان ذمہ داریوں کی ایک علامت ہے جو ایک آدمی کو دوسرے انسانوں کے درمیان ادا کرنا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا حق پہچانے، ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے درد مند ہو۔ یہ جذبات یہاں تک ترقی کریں کہ آدمی خود اپنی چیزوں تک میں دوسرے کا حصہ سمجھنے لگے۔ دوسرے سے کوئی معاوضہ نہ ملنے ہوئے بھی وہ اس کے کام آئے۔ دوسرے سے نفع کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی عزت کا نگہبان ہو۔ دوسرے سے رشتہ اور دوستی کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ زکوٰۃ ایک طرف آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ اس کی ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ تم اگر خدا کے بندے ہو تو تم کو معاشرہ کے اندر بے درد اور خود غرض بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ تمہاری زندگی میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔

سماجی تنظیم کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے کام صرف اس وقت آئے جب کہ اس کو دوسرے سے نفع کی امید ہو۔ وہ کسی کو قرض دے تو اس اعتماد پر دے کہ وہ سود کے ساتھ اس کی طرف اضافہ شدہ حالت میں لوٹے گا۔ ایسے معاشرہ میں استحصال کا مزاج فروغ پاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کو دبانا اور لوٹنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا سماج بدظنی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ سماجی تنظیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا سے بدلہ پانے کی امید پر دوسرے انسان کے کام آئے۔ وہ اس خدائی یقین و ہانی کی بنیاد پر دوسرے کو دے کہ خدا اس کو آخرت میں بہت زیادہ بڑھا کر لوٹائے گا۔ ایسے معاشرہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بے تعلقی کے جذبات فروغ نہیں پاتے۔ لوگ ایک دوسرے کو استحصال کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سماج میں باہمی ناراضی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر ایک دوسرے کی طرف سے امن میں رہتا ہے اور پورا سماج سکون اور خوش حالی کا سماج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ قانونی اعتبار سے ایک قسم کا سالانہ "ٹیکس" ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اپنی ملکیت میں خدا اور بندے کے حق کا اعتراف۔

۵۔ اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ سال میں ایک بار ساری دنیا کے مسلمان مرکز اسلام میں جمع ہوتے ہیں

اور وہاں مخصوص اجتماعی عبادات انجام دیتے ہیں۔ حج کی عبادت کیا ہیں۔ یہ دراصل ان اسلامی تعلیمات کو علامتی طور پر دہرانا ہے جو اسلام میں معنوی طور پر مطلوب ہیں۔ یہ اسلام کے احکام کو مخصوص صورتوں میں متشکل کر کے اللہ سے یہ عملی عہد کرنا ہے کہ آدمی انہیں بنیادوں پر اپنی زندگی کو قائم کرے گا۔ اسلام کی دوسری عبادات میں بھی اگرچہ یہ پہلو موجود ہے۔ تاہم حج میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور مجموعی شکل میں یہ تمام چیزیں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات ختم ہو جائیں اور تمام انسان ایک خدا کے بندے بن کر دنیا میں زندگی گزاریں، احرام باندھنا اسی کی ایک عملی صورت ہے جس میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی سادہ لباس پہننے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے، کعبہ کے گرد طواف کرنا اسی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے بنیں، صفاد مردہ کے درمیان دوڑ (سعی) اسی کی ایک مشق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب خدا کی پکار بلند ہو تو اس کے بندے اس کی پکار پر دوڑ پڑیں، حج کے دوران بار بار لبیک اللہم لبیک (حاضر ہوں خدا یا میں حاضر ہوں) کہنا اسی کا ایک عملی اقرار ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی اس دن کو یاد کرے جب کہ سارے انسان خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے، عرفات کے وسیع کھلے ہوئے میدان میں تمام حاجیوں کا قیام اسی کی ایک ظاہری یاد دہانی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی شیطان سے بیزار ہو اور ہمیشہ اس کو اپنے سے دور بھگانا رہے، رمی جمار کے موقع پر شیطان کی پتھر کی علامتوں پر کنکریاں مارنا اسی کا ایک عملی سبق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے عہد پر قائم رہے خواہ ایسا کرنا اس کے لئے جان و مال کی قربانی کی قیمت پر کیوں نہ ہو، منیٰ میں جانور کو قربان کرنا اسی کی ایک خارجی علامت ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کریں، حج کے زمانہ میں اس کی خصوصی تربیت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے لاکھوں لوگ بیک وقت ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ حج کے دنوں میں خصوصی طور پر لازم کر دیا گیا کہ غصہ، بد کلامی، مار پیٹ، کسی جان کو تکلیف پہنچانا، بے حیائی اور بددیانتی کے کام سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اللہ سے بہتر سلوک پانے کے شوق میں بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

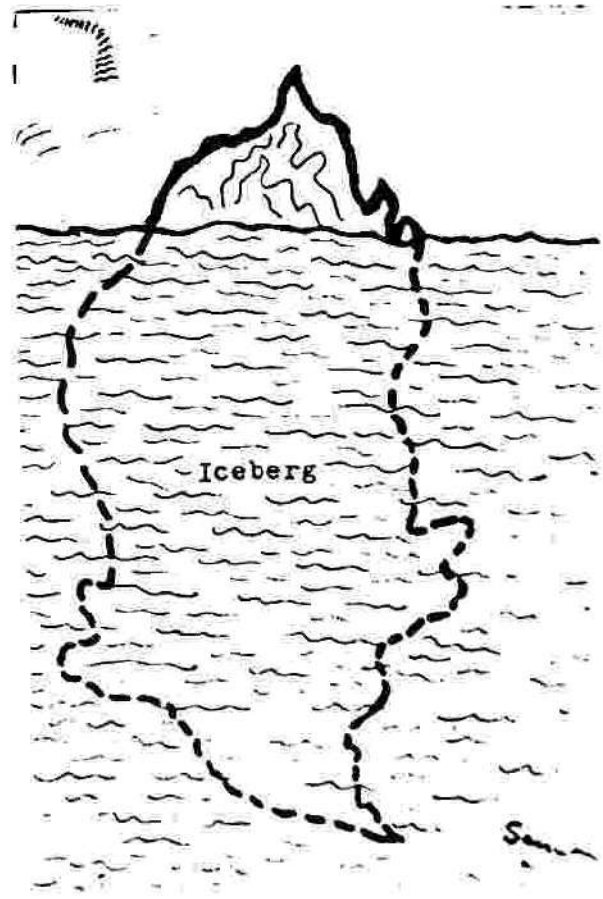
حج خداری زندگی گزارنے کا سبق ہے۔ وہ آخرت کے ہولناک دن کو یاد دلاتا ہے۔ وہ خدا کے لئے سرگرم ہونے کا یہرسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی کو خدا کے راستہ میں جدوجہد کرنے والا بننا چاہئے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے اس کو کبھی اپنے قریب آنے کا موقع نہ دو۔ اس کا پیغام ہے کہ اللہ کے انعامات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کر دو۔ وہ عملی حالات پیدا کر کے بتاتا ہے کہ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔ وہ انسانی مسازات کا عظیم الشان مظاہرہ ہے غرض حج ایک ایسی مکمل عبادت ہے کہ آدمی اگر اس کو صحیح طور پر انجام دے لے تو اس کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔ خواہ یہ مسازات خدائے متعلق ہوں یا انسانوں سے متعلق۔

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے ٹودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا ہوا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ اسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا لگ بھگ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پا کر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مرتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی۔ مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے ترپیتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش

آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے حد باعنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جدوجہد کی منزل کو پالے گا۔ اس کی زندگی — آخرت رخی زندگی (Aakhirat Oriented Life) ہو جائے گی جو بالآخر ایک شان دار کامیابی پر ختم ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوگی۔ اس کی کوششیں اس دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں دمالہ فی الآخِرۃ مِن خَلَاق (بقرہ ۲۰۰)



ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی ویژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی ویژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دینے والے ہیں اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی مل جاتے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں پڑے گا۔ عذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

ایک مرتبہ میں ایک بڑے سرکاری افسر سے ملا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ ان کے شان دار بنگلے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ”مولانا صاحب“ اچانک انھوں نے کہا ”ہم لوگوں کی زندگی بھی کیسی بری زندگی ہے۔ اب دیکھئے۔ کل صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مجھے ہوائی اڈہ پر جانا ہے۔ فلاں ملک کی اعلیٰ سیاسی شخصیت کا ہوائی جہاز ہماری زمین پر اترے گا۔ مجھ کو نہ صرف اپنی نیند کو چھوڑ کر ہوائی اڈہ پر پہنچنا ہے بلکہ دل میں نفرت کے باوجود مسکرا کر ان کا استقبال بھی کرنا ہے“

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگیاں کس طرح دورنجی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو کار اور کوٹھی اور عزت اور اقتدار ہے۔ مگر اس کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چیزیں انہیں کن باتوں کے نتیجے میں ملتی ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے آدمی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس چمک دمک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سطح پر راضی کیا ہے، خوشامد، موقع پرستی، مصلحت پسندی، زمانہ سازی، بے ضمیری ظاہر داری، دوغلی، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قیمت ان کو ایک شان دار زندگی کی صورت میں ملتی ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی کے دورخ ہیں۔ ایک شان دار، دوسرا تاریک اور بے روح۔ وہ اپنے ”انسانی وجود“ کو قتل کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ”حیوانی وجود“ کی سطح پر اس کو جاہ و حشم کی ایک زندگی حاصل ہو سکے۔

عام انسان کی زندگی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مزدوری جو ن کی گرمی میں کھلی دھوپ میں کام کر رہا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہے۔ مگر اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ وہ کیوں اپنے آپ کو مشقت کی آگ میں جلاتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس ”دھوپ“ کا ایک ”سایہ“ بھی ہے۔ اس کی مزدوری کا ایک پہلو گرمی اور لو میں جھلسنا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شام کو چند روپے حاصل کرے گا جس سے اس کے نبوی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی اور وہ رات کو اطمینان کی نیند سوائے گا۔

کسی عمل کے دورخ ہونے کا یہ وہ پہلو ہے جو صرف دنیوی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہر عمل جو آدمی اس دنیا میں کرتا ہے، اس کا ایک رخ وہ ہے جو دنیا میں نظر آتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو آخرت میں مترتب ہو رہا ہے۔ آج ہم اپنے عمل کے دنیوی پہلو کو بھگتتے ہیں۔ کل ہم اپنے عمل کے اخروی پہلو کو پائیں گے آج ہم زندگی کے ایک سمت میں کھڑے ہیں۔ اس لئے ہم کو اعمال کا ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے۔ قیامت ہم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دے گی جہاں دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں گے۔ جس طرح دیوار کے اوپر کھڑا ہوا آدمی دیوار کے دونوں طرف دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے عالم میں پہنچ کر آدمی حقیقت کے دونوں رخ کو دیکھنے لگے گا۔ ایک طرف پچھلی زندگی کی پوری تاریخ بچپن سے موت تک لمبی فلم کی طرح اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف اس کی اس بنائی ہوئی تاریخ کے اخروی نتائج بالکل برعکس ہو کر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوں گے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار)

اس دن آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس

نے پیچھے چھوڑا۔

دنیا کا کام دنیا میں رہ جائے گا اور آخرت کی زندگی کے لئے وہی چیز کارآمد بنے گی جو آخرت کے لئے کی گئی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے ناجائز طور پر دوسرے کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر اس کی قانونی خانہ پری "اسنی مکمل تھی کہ ظاہری طور پر اس کے خلاف فیصلہ دینا بھی مشکل تھا۔ آپ نے فرمایا "تمہاری ہوشیاری کی بنا پر اگر عدالت نے تمہاری موافقت میں فیصلہ دے دیا تو سمجھو کہ اس نے تم کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا۔ گویا اس آدمی کے عمل کا نتیجہ دنیوی اعتبار سے تو زمین کا ایک محبوب ٹکڑا تھا۔ مگر آخرت کے اعتبار سے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ تھا۔ وہ اپنے عمل سے پیچھے کی دنیا میں زمین چھوڑ رہا تھا اور آگے آخرت کی دنیا میں آگ بھیج رہا تھا۔

اسی طرح نیک اعمال کا معاملہ بھی ہے۔ امام احمد نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول غصہ کے بارے میں نقل کیا ہے :
 ما جمع عبد جردة من لبن او غسل خیر من کسی بندہ نے غصہ کے گھونٹ سے بہتر دودھ یا شہد جردة غیظ کا گھونٹ نہیں پیا۔

غصہ کو پی جانا دنیا کے اعتبار سے انتہائی کڑوا گھونٹ ہے۔ مگر اس عمل کا جو خردی ثمنی ہے، وہ دودھ اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہوتی ہے (ان شدتة الحر من فحج جہنم) اسی طرح حدیث معراج میں ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں آپ نے چار نہریں دیکھیں۔ دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر۔ جبریل نے بتایا کہ اندر اندر بہنے والی نہریں تو بہشت کے دریا ہیں اور اوپر اوپر بہنے والے نیل اند فرات۔ گویا موجود دنیا اور آخرت کی دنیا ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیوی پہلو حقیر اور عارضی ہے۔ اخروی پہلو بہتر اور مستقل۔ آج ہم دنیوی پہلو سے دوچار ہیں۔ موت کے بعد ہم اخروی پہلو سے دوچار ہوں گے۔

انسانی عمل کے اس دو گونہ پہلو کو حدیث معراج میں مختلف تمثیلات کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

بستی میں ایک شخص ہے۔ اس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنے لئے ہر قسم کی عزت اور خوش حالی جمع کرنی ہے۔ وہ جب کسی مجلس میں داخل ہوتا ہے تو اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجلس کا سردار آ گیا ہے۔ اسی بستی میں دوسرا شخص ہے۔ وہ بالکل ناکام ہے، اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار لینے کے باوجود وہ اپنی مفلوک الحالی کو ختم نہ کر سکا۔ اگر وہ مجلس میں آجائے تو کوئی اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آدمی مجلس میں آیا ہی نہیں۔

دونوں بظاہر ایک ہی قسم کے انسان ہیں۔ دونوں یکساں قسم کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی عزت یا اپنی مفلسی کا پشتارہ لے کر نہیں آتا۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ آدمی کا وہ دہرا وجود ہے جس کو "حیثیت" کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے دکھائی دینے والے وجود کے ساتھ اپنی نہ دکھائی دینے والی حیثیت کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ظاہری جسم آدمی کو پیدائشی طور پر ملتا ہے اور غیر موسمی حیثیت کو آدمی اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا ایک دنیوی وجود ہے اور ایک اخروی وجود۔ دنیوی وجود پیسے اور اقتدار سے بنتا ہے اور اخروی وجود خدا ترسی اور نیک عمل سے۔ آج کی دنیا میں آدمی اپنے دنیوی وجود کے ساتھ جی رہا ہے اور آخرت میں وہ اپنے اخروی وجود کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

نیکی کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی بر عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی ذمہ دار عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکارتی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار یا کردہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

کسی درخت پر کوئی پتھر ٹکا ہوا ہے، آپ اس کے بچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پختے ہیں اور ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں، خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا۔ مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا" اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کر کے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی برائی کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی

یہ صورت حال پکا رہتی ہے کہ موجود دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھارہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھارہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔ آخرت کا نظریہ ان تمام بہترین آرزوؤں اور تمناؤں کو باطنی بناتا ہے جن کو ایک آدمی اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود ان کو واقعہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہر قسم کے ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا ہو بالفرض اپنے لئے ایک پسندیدہ زندگی بنانے تب بھی بڑھاپا اور موت اس کی ہر کامیابی کو بہت جلد بے معنی بنا دیتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ بتاتا ہے کہ اس کے خوابوں کی دنیا کہاں ہے اور اس کی مطلوبہ "جنت"، کس سمت میں ہے جہاں اس کو درود و صوب کرنی چاہئے۔ آخرت آدمی کی منزل کو بھی بتاتی ہے اور اس کی جدوجہد کے صحیح رخ کو بھی۔

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کر دے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دنیا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں جس طرح ایک بُر عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کر سکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔ اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کر کے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک جنت چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا دیکھئے جو محدود دیتوں اور نقصانوں سے پاک ہو۔

ہدایت کا انتظام

خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے غیر معمولی انتظامات کئے ہیں۔ پیغمبر کے ذریعہ اپنی کتاب آداری ہے۔ کائنات میں بے حساب پیمانہ پر اپنی نشانیاں پھیلا دی ہیں۔ اسی کے ساتھ خدا کے فرشتے ہر قدم پر کھڑے ہوئے خاموش زبان میں اس کو بتاتے رہتے ہیں کہ حق کیلئے اور حق کیا۔ ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے۔ ”اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا۔“ انھوں نے اپنے دل میں سوچا اس کے اعلیٰ دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دو بار وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کر کے گل کے غصہ کی تلافی کی۔

”اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا“ ان کے دل میں خیال آیا اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔ ”اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصور دار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاقاً محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جاسکتا تھا۔“ اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہرزہ وہ اپنے گرد و پیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے ہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوجھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھینگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آگئے۔ ”اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے“ اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا ”یہ دین کے اد پر لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پٹو کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا“ اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ قائل دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں“

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دہلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں ”علیکم السلام“ تو کہا مگر دل میں سوچا ”یہ شخص بھی کتنا بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے“ ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور سکر اتے ہوئے پوچھا کہاں سے آنا ہوا“ پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے ”آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں“ میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کہیں گویا یہ نودار دیکھ کر غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان کے لئے بھیج دی ہے۔

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی بلچل پیدا ہو رہی ہے ”مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے“ انہوں نے اپنے دل میں کہا ”اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے“ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا کرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستے کو پاسکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تا۔ وہ برہمچلن پگرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے :

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر انہیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھکتے۔ (اعراف ۲۰۴)

انسان کی تلاش

انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پاسکے، جو عیب اور محدودیت سے خالی ہو۔ مگر موجودہ دنیا میں اس کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سی دی۔ رمن ہندستان کے مشہور ترین سائنس دان ہیں۔ انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ ان کو سائنس کا نوبل انعام ملا۔ ان کی ایک سائنسی تحقیق (۱۹۲۸) نے رمن ایفیکٹ کے نام سے عالمی شہرت حاصل کی۔ بنگلور میں ان کے نام پر رمن انسٹیٹیوٹ قائم ہے۔ ان کو اپنے سائنسی مطالعہ میں اتنا انہماک رہتا تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی آمد کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک آنے والے کے پرچہ ملاقات کو دیکھ کر کہا: ”یہ ملنے کے لئے آنے والے اس ابتدائی آداب کو بھی نہیں جانتے کہ مجھے تنہا رہنے دیں۔“ رمنی فون کی گھنٹی بجتی تو اکثر وہ ”ایس، یا“ کہہ کر ریسور رکھ دیتے۔ ان کے یہاں کثرت سے خطوط آتے تھے جن کو بس ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ سیاست دانوں کی بابت ایک بار انہوں نے کہا: ”انڈیا میں کامیاب ہونے کے لئے آج کل جو چیز درکار ہے وہ صرف یہ کہ آپ کے سر پر ایک گاندھی ٹوپی ہو اور اس کے نیچے کچھ نہ ہو۔“ ڈاکٹر رمن کی خود اعتمادی اتنی بڑھی کہ انہوں نے مذہب کا بھی انکار کر دیا۔ انہوں نے ایک بار ایک اخباری نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ”نہ کوئی جنت ہے اور نہ کوئی دوزخ۔ اور نہ موت کے بعد آدمی کا کوئی وجود ہے“

مگر آخر عمر میں ڈاکٹر رمن سخت مایوسی کا شکار ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں اپنے انتقال سے کچھ پہلے انہوں نے کہا تھا ”میری زندگی مکمل طور پر ایک ناکام زندگی رہی“:

My life has been an utter failure (T.O.I. 21-1-1979)

ڈاکٹر رمن کو اتنا بڑا مقام حاصل ہونے کے باوجود یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس کا وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو نہ پاسکے۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ملک میں سچی سائنس (True Science) قائم کریں۔ مگر جن ملکی سائنس دانوں سے انہوں نے کام لینا چاہا، ان کے متعلق ان کا تجربہ یہ رہا کہ وہ مغرب کی تقلید اور اس کی خیمہ برداری کے سوا اور کوئی مزاج نہیں رکھتے۔ وہ انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس (بنگلور) کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے چاہا کہ نازی حکومت کے نکالے ہوئے جرمن سائنس دانوں کو بلائیں۔ مگر حکومت نے اپنے سیاسی کھسارے کے تحت اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ خود اپنا جمع کیا ہوا تمام سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر ایک سائنسی ادارہ قائم کریں۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ ان کی رقم ایک پرائیویٹ بینک میں تھی جو دیوالیہ ہو گیا اور ان کی ساری رقم ڈوب گئی۔ وہ شخص جو اعلیٰ احوالوں اور اونچی تنخواؤں کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا تھا وہ ایک انتہائی مایوس انسان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ ایک ”کامیاب مرد“ کا قصہ تھا۔ اب ایک ”کامیاب عورت“ کا حال دیکھئے۔

”ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں“

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پاسکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے دوجے نگر کے مکان میں
آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک
گردن پر ایک گوڑا بھر رہا ہے۔ ”زندگی زیادہ مکمل اور
بے عیب کیوں نہیں“

Why life could not have
been more perfect.

اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک
کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دوہم پیشہ بہنوں (پدما اور
جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کستیر کے ایک رنگارنگ سفر
سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور
زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں
کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے
۱۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں ”دوجے نگر سٹریٹس“
کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں
شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدناما گردن
کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔
مگر خلاف امید اس کا گوڑا بڑھتا گیا۔ گھردالوں
کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوز شروع
ہوئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی
کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال
میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آ گیا۔ بستر
پر ایک بے حس و حرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور
رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ

رہے تھے ”وہ منستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی“

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد

نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے ”نرتیہ نندنی“ کے نام سے
ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشنولیت
ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید
اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن،
جنیوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں
اپنے کمال فن کی داد لے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی
کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile
when the bells on the
Vijayanagar sisters tinkle

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب دوجے نگر
بہنوں کے گھونگر دوجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں ”رقص رانیوں“ کی
شادی روایتی جشن کے ساتھ ہو گئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے
بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گوڑا بھر رہا ہے۔
دواؤں اور آپریشن کے بعد گھردالوں نے سمجھا کہ ان
کی جے شری اچھی ہو چکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی
رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ ”بے وقوف
نہ بنو جے شری“، ڈاکٹر نے کہا ”تمہارے جیسی جوان
اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہو سکتا ہے“ اس
کے بعد گوڑا کا ایک ٹکڑا ٹائما میموریل اسپتال (مبئی) کو جانچ
کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب
اس کی بہن کو بھی کینسر ہو چکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ
سے گزر کر پیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج
کے باوجود تکلیف بڑھتی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴
کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر چھوڑ

کہ اس سے جدا ہو گئی۔

ظاہری رونقیں اور ساز و سامان جمع کر لینے کے باوجود حقیقی خوشیوں کی زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایک شخص ضروریات زندگی کا محتاج ہونہ سمجھتا ہے کہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کی ضرورتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ جب وہ کوشش کرے کہ ضرورت کی چیزیں پالیتا ہے تو اب اس کو عیش و آرام کی طلب ہوتی ہے۔ اب ضرورت کی چیزوں میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں ہوتی۔ اب وہ رات دن یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ عیش کے سامان اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اگر حالات اس کا ساتھ دیں اور وہ عیش کی چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ جن چیزوں کو پہلے وہ حرص کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، اب ان میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد اس کے اندر ایک اور چیز کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہے عزت اور مرتبہ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقام سب سے اونچا ہو جائے۔ مگر یہ چیز اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا کہ جو لوگ اس کو اپنے سے کم تر دکھائی دیں ان پر اپنی بڑائی کا مظاہرہ کر کے اپنی ہوس کی تسکین حاصل کرے۔ اور جو لوگ اس کو اپنے سے اوپر دکھائی دیں ان کے خلاف حسد اور بغض کی آگ میں جلتا رہے وہ انھیں تاریکیوں میں جھکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ چانک اس کی موت آجاتی ہے اور وہ آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ اپنے لئے ایک زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک زندگی کا آغاز کرے۔ دنیا کی کامیابیاں بھی اتنی ہی بے قیمت ہیں جتنی دنیا کی ناکامیاں۔ مگر انسان اپنی خوش خیالیوں میں گم رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اس کی خوش خیالیوں کی دنیا سے باہر نکالنے والی ثابت ہو۔

”وجے مگر سسٹرس“ کا جگمگاتا ہوا مکان اب تاریک ہو چکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھولے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ ”نرتیہ نندی“ اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ء سے ”شری آرنس انٹرنیشنل“ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر تیسری بہن پیدا اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جو وہ اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو نے اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں۔ ”زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں“ اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A PSYCHOLOGICAL AMPUTATION IS NO LESS REAL THAN A PHYSICAL ONE.

Eve's Weekly (Bombay) 2.6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔ یہ کوئی اتفاقی مثال نہیں۔ ہمارا پورا سماج اسی قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ مہنتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو بظاہر کامیابیوں کی جگمگاہٹ میں زندگی گزارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو بھی اندر سے جھانک کر دیکھئے تو خوش نما جسموں کے اندر ایک غم ناک اور ادا اس روح بسی ہوئی نظر آئے گی۔ موجودہ دنیا میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں، آدمی کو اتنے مختلف قسم کے ناموافق حالات میں رہنا ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے چھوٹے ہوئے فتنے اس طرح سکون کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے،

دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو زندگی بھر ناکامی و نامرادی کے احساس سے دوچار رہتے ہیں۔ تاہم وہ لوگ جن کو دنیا میں بہترین مواقع ملے۔ جنہوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہاریں اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا خاتمہ بھی اکثر بدترین مایوسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حادثہ، بیماری، منصوبوں کا ناکام ہوجانا۔ اور اگر بالفرض کوئی ان ناخوش گوار یوں سے بچ جائے تو آخر میں موت۔ کتنے لوگ ہیں جو "کامیابی کے ساتھ" اپنا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تنداؤں کے محل کو ڈھادتی ہے جب کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے دروازے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

کیا انسان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ انتہائی قیمتی صلاحیتیں لے کر آئے اور بالآخر ایک بدترین ناکامی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر آخرت کو حذف کر کے زندگی کو دیکھا جائے تو زندگی ایک الم ناک ڈرامے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتی۔ ہم خواہ کچھ بھی کریں، موجودہ دنیا میں ہم اپنی آرزوؤں کی جنت تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہماری محدودیتیں فیصلہ کن طور پر ہماری راہ میں حائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرت آخرت کا عقیدہ ہے جو انسانی زندگی کو با معنی بناتا ہے۔ آخرت کے عقیدہ میں ہم اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں جس کی طرف ہم یقین کے ساتھ سفر کر سکیں، جہاں ہم اپنی کوششوں کا انجام پانے کی قلمی امید کر سکیں۔ آخرت کو نہ ماننے والے کو اپنے سامنے مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کہ آخرت کو ماننے والا اپنے سامنے امیدوں کا اتھاہ مستقبل دیکھتا ہے۔ زندگی آخرت کے بغیر انتہائی بے معنی ہے مگر زندگی آخرت کے ساتھ اتنی با معنی ہوجاتی ہے کہ انسانی زبان میں وہ الفاظ ہی نہیں جو اس کو بیان کر سکیں

ہالی وڈ (امریکہ) عیش پسندوں کے لئے دنیا کی سب سے بڑی جنت ہے۔ ساری دنیا کے "محرور" لوگ ان "پائے ہوئے" لوگوں پر رشک کرتے ہیں جن کو اس جنت ارضی میں کوئی حصہ ملا ہو۔ مگر ہالی وڈ کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بظاہر قابل رشک لوگ بے حد قابل رحم حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے انتہائی خوش قسمت لوگ، سب کچھ پالینے کے بعد بالآخر آتا ہٹ (Boredom) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی کاریں ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آج اپنی مختلف کارڈوں میں سے کس کاریں بیٹھ کر جائیں۔ تاہم ان کی بے اطمینانی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ آپس میں اپنے مکان حتیٰ کہ بیویوں کا تبادلہ کرتے ہیں تاکہ تنوع کے ذریعہ اپنی آتا ہٹ کو کم کر سکیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان لا محدود اطمینان چاہتا ہے۔ دنیا کی چیزیں اس کو صرف محدود اطمینان دیتی ہیں اس لئے وہ اس کی تسکین نہیں بنتیں۔ یہ صرف خدا ہے جو انسان کی طلب کا حقیقی اور ابدی جواب ہے۔

الا بن کواللہ تطمئن القلوب
سن لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ اس ہستی میں اپنا دل لگا یا جائے جو حقیقی اور ابدی ہے۔ اپنی امیدوں اور حوصلوں کو اس عالم سے وابستہ کیا جائے جو ان تمام کمیوں سے پاک ہوگی جن کی وجہ سے موجودہ دنیا ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں بنے پاتی۔ جو آدمی اللہ کو پالتا ہے وہ گویا اپنا سب کچھ پالیتا ہے۔ دنیا میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تب بھی وہ مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ بالآخر اس کو منزل تک پہنچانے والا ہے۔

خدا — انسانی فطرت کی آواز ہے

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان کے اخبار ڈان کے ایڈیٹر تھے بھٹو حکومت (۷۷ - ۱۹۷۱) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کر لے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنے صحافتی مشاغل کی ہمابی میں بے تیر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہ سوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک باہل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھڑی تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہو جانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنا دیا۔ ان کی فطرت، غیر ارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پاسکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچادیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو، جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ**، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت مبرہم میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے، جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I REMEMBER VIVIDLY THE MOMENT WHEN I FIRST REALIZED THE SIGNIFICANCE OF THIS VERSE. 'WE WORSHIP YOU ALONE, AND TO YOU ALONE WE TURN FOR HELP. IT WAS A DRAMATIC MOMENT OF FREEDOM, A MOMENT IN WHICH FEAR DISAPPEARED, AND WITHIN ME I FELT A RESURGENCE OF CONFIDENCE AND FAITH.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں" یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

ناشکر ہے۔ (لقمان ۲۱-۲۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۹۲۳-۱۹۴۹) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۹۰۵-۱۹۶۴) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ء میں ماسکو کا سفر کیا تاکہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لئے روسی ایڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

MAY GOD PROSPER THIS UNDERTAKING

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

Winston S. Churchill,
The Second World War (Abridgement)
Cassell & Company
London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر چرچز وکس کے افراد خاندان جب آخری فوٹو گراف کے لئے داسٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹو گرافروں کا فوٹو لیٹھیں کافی دیر لگی۔ کیونکہ صدر وکس سمیت سب لوگ رو رہے

خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ عام حالات میں یہ آواز چھپی رہتی ہے۔ مگر جب زندگی میں کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو یہ آواز جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس فطرت سے خالی نہیں۔ فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گائنا لولوبریڈا (GINA LOLLOBRIGIDA) جنوری ۱۹۷۵ء میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال وجواب یہ تھا:

TO A QUESTION WHETHER SHE BELIEVED IN GOD, GINA SAID: I BELIEVE IN GOD. I BELIEVE IN GOD, MORE WHEN I AM ON AN AEROPLANE.

Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گائنا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔ آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ”کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمہیں اپنی قدر میں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں، مگر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر نہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی کرتا ہے جو بد عہد اور

تھے اور فوٹو گرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسوؤں کا کوئی لمحہ ملے تو شاٹ لے سکے۔

وائرگیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صد نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ محقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آگئی اور نکسن کی صدارت ایسے بھونچال کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

وائرگیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ واٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انہوں نے خود کشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام THE FINAL DAYS نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

AS THE END NEARED, NIXON ASKED SECRETARY OF STATE HENRY KISSINGER TO "KNEEL AND PRAY WITH HIM, SAYING:

"YOU ARE NOT A VERY ORTHODOX JEW AND I AM NOT AN ORTHODOX QUACKER, BUT WE NEED TO PRAY."

Daily American (Rome) 27.3.1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آ گیا، نکسن نے سلاطین سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسینجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔
"نہ تم زیادہ بڑے یہودی ہونے میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں،" نکسن نے کہا

اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۳۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر، ۱۹۱۷ء میں

آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کروڑ ۲۵ لاکھ شہریوں میں ۲۲ کروڑ ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پر واپس چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ وہ ہے

جو ۱۹۷۳ء میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی

جہاز (ILYUSHIN JET) ہندستان میں مغربی

بینگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا

ہوا بازی کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز

زمین پر گر پڑا۔ ہوا بازی سمیت سارے مسافر جل کر

ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سر زمین پر ہوا تھا

اس لئے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس

کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس

میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خود کار مشین رکھی جاتی

ہے جس کو عام طور پر (BLACK BOX) کہتے ہیں۔ یہ

غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز
ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ چیز مجھے بائبل کے ان
جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے
کس کی دہشت۔

خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس
کی ہیبت۔

خواہ میرے خلاف لشکر خمیر زن ہو۔

میرا دل نہیں ڈرے گا۔

خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔

تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶۔ آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے
شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولہ انتہین اور سحراروف
اسی روحانی کش مکش کی ایک علامت ہیں۔ سولہ انتہین
کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت ملی ہوتی تو وہ اس
رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف
کرتا۔ سولہ انتہین کے ایک قریبی دوست دیلتری
پینی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور
پہلو کیا ہے۔ اس نے بلا تردد جواب دیا:

THE HUNGER OF ORDINARY PEOPLE
FOR MORAL AND SPIRITUAL TRUTH

”عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی
سچائی کو پاسکے“

بلیک باکس ہو باز اور کٹر دل ٹاؤر کے درمیان گفتگو
کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دم میں
رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے چلنے کے بعد بھی وہ
پہنچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے طبع سے
اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا تپ
بجایا گیا تاکہ اس سے تقشیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم
ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہوا باز کی زبان
سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

PETER SAVE US

(سینٹ پیٹر، ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس
حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور
عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵۔ کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانا

SVETLANA ALLILUYEVA اس کے بعد عیسائی
مذہب قبول کر لگی۔ سویتلانا اشتراکی دنیا سے
مایوس ہو کر ہندوستان آئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ
کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہائے حکمرانوں
کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔ روس دوستی کے خلاف
معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں
عیسائیت کو اختیار کر لیا۔

سویتلانا اپنی کتاب ONLY ONE YEAR

(صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں

جو شخص گھنٹہ اور عصیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی
ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

نماز سے آغاز

مولانا محمد علی ایم اے (کینٹب) اپنی تفسیری کتاب میں لکھتے ہیں: "ایک دفعہ راقم الحروف کے یہاں بہت سے احباب جمع تھے۔ ان میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ مولوی صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جس قوم کے پاس نماز اور زکوٰۃ جیسے دو بے مثال ادارے (Institutions) ہوں وہ قوم کیوں ذلیل و خوار ہو" قرآنی دعوت انقلاب، ۱۹۵۱، مکتبہ شعر و ادب لاہور، صفحہ ۳۱۶

نماز اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کا نام ہے اور زکوٰۃ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں اپنے مال کو قربان کرنا۔ جو ان دونوں عبادتوں کو حقیقی طور پر اپنی زندگی میں شامل کرے، اللہ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کو ابدی جنت میں جگہ دیتا ہے۔

یہ نماز اور زکوٰۃ کا اخروی پہلو ہے اور یہی ان کا اصل مقصود ہے۔ تاہم ان عبادتوں کے زبردست دنیوی فائدے بھی ہیں۔ نماز اگر صحیح شعور کے ساتھ قائم کی جائے تو وہ سارے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیتی ہے اور اتحاد بلاشبہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زکوٰۃ وسیع ترین قسم کا سوشل انشورنس ہے۔ کسی مسلم گروہ میں زکوٰۃ کا نظام اگر پوری طرح قائم ہو جائے تو اس کے اندر سے یہ مسئلہ سرے سے ختم ہو جاتا ہے کہ اس کے کچھ افراد مایاتی کمی کے سبب سے اپنے لئے قابل اعتماد معاشی بنیاد نہ پاسکیں۔ زکوٰۃ کا نظام اس بات کی ضمانت ہے کہ قوم کا صرف ایک حصہ خوش حال نہ ہو بلکہ پوری قوم مجموعی حیثیت سے ترقی کرے۔

نماز اور زکوٰۃ، دنیوی اعتبار سے، اتحاد اور فارغ البالی کی علامتیں ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قوم میں پیدا ہو جائیں، وہ بلاشبہ عزت و سربلندی حاصل کرے گی۔ کوئی اس کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔ نماز آدمی کے اوپر خدا کے حقوق کو بتاتی ہے اور زکوٰۃ آدمی کے اوپر آدمی کے حقوق کو۔ خدا کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ آدمی کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں اتنی بنیادی ہیں کہ اگر وہ کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جائیں تو اس کے سارے معاملات کو درست کر دیتی ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا نہ صرف اس کو خدا کی نظر میں محبوب بناتا ہے اور خدا اس پر اپنے انعامات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو ہر قسم کی دنیوی ترقی کے ضامن ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا اپنے رب کے سامنے اپنی عبدیت کا اقرار ہے اور عبدیت کا شعور جن لوگوں میں زندہ ہو جائے ان کا معاملہ جب دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے تو یہ شعور وہاں تواضع، بے غرضی، انصاف پسندی اور حق کے لئے سپراندازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ نہ صرف بندے کے اوپر بندے کے حق کو یاد دلاتی ہے بلکہ یہ سبق دیتی ہے کہ تمہاری انسانیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک تمہارا یہ حال نہ ہو جائے کہ اپنی ذاتی چیزوں میں بھی دوسرے کا حق سمجھنے لگو۔

نماز کے اندر ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا عمل ظہور ہے۔ اس کی اس خصوصیت نے حیرت انگیز طور پر نماز کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دی ہے۔

چار برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا۔ موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں، تو میرا جواب کیا ہوگا۔ اسی اثنا میں ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالیٰ نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: "ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں۔" مخاطب کی رعایت سے خواب کی گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میری ذہن کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim, you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کا یہ تجربہ "ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو جگر خواہ کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں ظلم اور گھنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ ابن مندہ نے روایت کی ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ ابوسفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔ انہوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی
 ہذا المسجد قبل اللیلۃ، واللہ ان باتوا إلا
 مصلین قیاماً و رکوعاً وسجوداً
 خدا کی قسم، آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس
 مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت
 کرنے کا حق ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے
 رہے۔ انہوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

"وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحتوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے کھل کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی غفلت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا۔"

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مثل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو قابض کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور بے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرائیں منگولوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا اور میدان جنگ میں رمال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کر رہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کر لیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کر رہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے۔"

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر سمجھا ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسین بیگل (سابق ایڈیٹر الہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خروشیچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے:

"خروشیچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشیچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشیچوف نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ ناصر صبری دیر وضو

کرتے رہے، خروشیچوف بذات خود تالیف لئے کھڑا رہا، اس نے بڑی عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا۔"

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ مجبوری پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر سکتی۔ نماز اسی فطری جذبہ کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہو کر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں۔ اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔"

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بتایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابوطالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحب زادے علی بن ابی طالب ابتداءً نماز ہی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے، اور پھر اسلام کے سب سے بڑے جان باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ بن سکتی ہے۔ فطری کشش تو اس کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تجرباتی اور شہادتاتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کر دی ہے۔ آقا کا انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جلنے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کر سکے۔ نماز اس ضرورت کو کمال درجہ

میں پورا کرتی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہو تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی (معدنی ماہمک) جلب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے روحانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دوسرے سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کلم کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ مہبود کی پرستش کا اس سے بجز کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجاتِ آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے باایمان نمازی ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی کیفیات کو جاننے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص اگر وہ سنجیدہ ہو، ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقورہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کر کے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پاسکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مگر کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ اس حلقہ کا خاص مقصد خاموش اسلامی دعوت ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹہ اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالخصوص اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقہ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عورت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کر کے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پر دو گرام کا سب سے اہم جزو نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمہ داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدا خواستہ اس کا کوئی نتیجہ نکلا تو آخرت میں انشا اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں لوگوں میں ہوگا جنہوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پر دو گرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو ”مستلم“ مقرر کر لیں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ باہم خاموش رہیں اور مستلم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وجید الدین خاں کے قلم سے



● **تہذیب اور جدید چیلنج**
(علم جدید کا چیلنج کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن)
صفحات 224 قیمت Rs. 13/50

● **اسلام دینِ فطرت**
صفحات 48 قیمت Rs. 2/-

● **ماہنامہ "الرسالہ"**
اپنی نوعیت کا واحد دینی اور
تعمیری رسالہ
زر تعاون سالانہ - Rs. 24/-

● **تجدیدِ دین**
صفحات 48 قیمت Rs. 2/-

● **الاسلام**
صفحات 176 قیمت Rs. 12/-

● **زلزلہ قیامت**
صفحات 64 قیمت Rs. 3/-

● **عقلیاتِ اسلام**
صفحات 48 قیمت Rs. 2/-

● **دین کیا ہے**
صفحات 32 قیمت Rs. 1/50

● **تعمیرِ ملت**
صفحات 48 قیمت Rs. 2/-

● **ظہورِ اسلام**
صفحات 200 قیمت Rs. 12/-

● **تاریخ کا سبق**
صفحات 48 قیمت Rs. 2/-

● **مکتبہ الرسالہ**

● جمعیت بلڈنگ - قاسم جان اسٹریٹ - دہلی - 110006

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ظہور اسلام

تالیف :

مولانا وصی الدین خاں

صفحات ۲۰۰ — قیمت بارہ روپے
آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت کے ساتھ
جدید اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶